سانحۂ کارگل کے اصل حقائق

جنٹلمین استغفر اللہ

کرنل (ر) اشفاق حسین



سانحہ کارگل کے اصل حقائق

جنٹلمین استغفراللہ

کرنل (ر) اشفاق حسین

ادارہ مطبوعات سلیمانی

کتاب کا نام	:	جنٹلمین استغفراللہ
مصنف	:	کرنل (ر) اشفاق حسین
ناشر	:	حکیم [illegible] سلیمانی
مطبع	:	[illegible]
طبع اول	:	[illegible]
طبع دوم	:	[illegible]
طبع سوم	:	[illegible]
تعداد	:	[illegible]
قیمت	:	[illegible] روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ مطبوعات سلیمانی

[illegible]
E-mail: idarasulemani@yahoo.com

’’وقت آ گیا ہے کہ
ان حقیقتوں کو بے نقاب کیا جائے جواب تک
اسرار کے پردوں میں چھپی ہوئی تھیں۔‘‘

جنرل پرویز مشرف (ریٹائرڈ)
ان دی لائن آف فائر
’’تنازعہ کارگل‘‘۔ صفحہ ۸۷ فری پریس۔ نیو یارک ۲۰۰۶ء



فہرست مضامین

- عرض ناشر ۹
- دیباچہ ۱۱
- تعارف ۱۷
- دو کارگل ...... ناکام فوجی مہم جوئی اور سیاسی بربادی ۲۱
- عقل بے مایۂ امامت کی سزاوار نہیں ۲۹
- پس منظر ۳۵
- ورائے عقل تھیں اہل ''ہوس'' کی تدبیریں ۴۷
- تھکے ماندے فوجی۔ لائن آف کنٹرول کے پار ۵۹
- ایٹمی دھماکے اور سفارتی سرگرمیاں ۷۱
- سینئر کمانڈر .... لائن آف کنٹرول کے پار ۷۹
- مگر یہ بات چھپانے سے کب چھپی رہتی ۸۳
- حکومت پاکستان اور جرنیلوں کی مہم جوئی ۸۷
- یلغار ۹۱
- توپخانے کی کارکردگی ۱۱۱
- شباب جس کا ''تھا'' بے داغ، ضرب ''تھی'' کاری ۱۱۹
- ہے تری شان کے شایاں' اسی مومن کی نماز ۱۳۱
- گلاب کی خوشبو ۱۴۳
- ...... آتش نمرود میں عشق ۱۷۵
- طویل ترین دن ۱۸۵
- اختتامیہ ۲۱۹

عرض ناشر

جنٹل مین استغفراللہ پاک فوج کے چار جرنیلوں کی مہم ''کارگل آپریشن'' سے متعلق کتاب ہے، جس سے ان کی ناقص منصوبہ بندی، کور کمانڈروں، بحریہ اور فضائیہ کے سربراہان سے عدم مشاورت ثابت ہوتی ہے۔ ان جرنیلوں نے دشمن کی فوجی قوت کا جائزہ لیا، نہ اس بات کا خیال رکھا کہ اپنے سپاہیوں کو خوراک اور جنگی سامان کیوں کر فراہم کیا جائے گا۔ بالا ہیڈ کوارٹروں کے آفیسر اور سول آفیسرز تک اس مہم جوئی اور ان کے مقاصد سے بے خبر تھے۔ چند یونٹوں کی جانب سے جب انہیں اطلاع دی گئی کہ وہ کارگل۔ دراس روڈ تک پہنچ گئے ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔

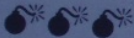
اس مہم جوئی کے دوران اگر عقل سلیم سے کام لیا جاتا، مغرب میں درہ زوجیلا پر قبضہ کر کے کارگل۔ دراس روڈ کو بلاک کر دیا جاتا اور دشمن کو مقبوضہ چوکیوں کی طرف نقل و حرکت سے روک دیا جاتا تو شاید پاک فوج کا وہ نقصان اور جگ ہنسائی نہ ہوتی جس کا نشانہ ملک و قوم کو بننا پڑا۔ اس مہم جوئی کی وجہ سے پاکستان بین الاقوامی سطح پر سفارتی اور اخلاقی محاذ پر بے دست و پا ہو گیا اور پاکستان کو اپنی فوج واپس بلانا پڑی۔

امریکی کانگریس نے آئی ایم ایف، عالمی بینک اور ایشیائی بینک پر دباؤ ڈالا کہ

وہ پاکستان کو ملنے والے قرضے منسوخ کرے۔ جس کے نتیجہ میں اسے ملنے والا ایک ارب ڈالر کا قرضہ منسوخ کر دیا گیا۔

جنرل پرویز مشرف، لیفٹیننٹ جنرل محمود، لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان، میجر جنرل جاوید حسن نے اپنا قد بڑھانے کے لیے پاک فوج کی ان بے لوث قربانیوں اور ساکھ کو ضائع کر دیا جو انہوں نے اقوام متحدہ کی امن قائم کرنے والے دستوں کے ساتھ کام کر کے بنایا تھا۔ اس طرح قوم کو بدنام اور ملک کو بے توقیر کر کے اسے جمہوریت کی پٹڑی سے اتار دیا گیا۔ جس کی وجہ سے قوم آج بھی بحران کا شکار ہے اور ان مقاصد سے اور منزل سے دور کھڑی ہے جس کے لیے یہ ملک بنایا گیا تھا۔

عروہ وحید سلیمانی



دیباچہ

کارگل آپریشن میں سیاست اس قدر ملوث ہو چکی ہے کہ اس کا ایسا معروضی تجزیہ کرنا جو ہر طرح کی رنگ آمیزی سے پاک ہو، مشکل کام ہے۔ جب تک بلند بانگ دعووں سے حقائق چھان کر الگ نہ کئے جائیں اور تجزیہ نگار، پوری دیانتداری سے غیر جانبداری نہ برتے، کسی فوجی اپریشن کا سرجن کے روایتی نشتر سے پوسٹ مارٹم نہیں کیا جا سکتا۔ اشفاق حسین نے جو پیشے کے لحاظ سے ایک فوجی ہیں (ریٹائرڈ کرنل)، اصل ذرائع سے حاصل کردہ معلومات مہیا کر کے یہ مقصد پورا کرنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کتاب ان افسروں اور جوانوں سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی ہے جنہوں نے اس آپریشن میں حصہ لیا۔ درحقیقت صحیح نتائج پر پہنچنے اور یہ جاننے کے لئے کہ یہ آپریشن کامیاب تھا یا نہیں، یہ ایک بہت ہی معروضی کوشش ہے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں سب سے پہلی قربانی سچ کی ہوتی ہے۔ کارگل آپریشن بڑے واضح انداز میں اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پاک و ہند کی تاریخ میں دونوں ملکوں کے ایٹمی قوتیں بننے سے پہلے کی مکمل جنگوں اور لائن آف کنٹرول پر جاری مسلسل جھڑپوں سمیت شاید کوئی اور آپریشن اتنا متنازعہ نہیں ہوا، جتنا کارگل آپریشن۔ عام طور پر اگر کوئی کسی جنگ میں کامیابی حاصل کرتا ہے تو اسے کچھ

چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ ناکامی کی یہ ضرورت ہوتی ہے کہ حقائق کو مسخ کیا جائے اور اصل واقعات پر پردہ ڈالا جائے۔ اس عام محاورے میں بڑی سچائی ہے کہ کامیابی وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ اس میں یہ اضافہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ناکامی وہ جو منہ چھپاتی پھرے۔ کارگل آپریشن ہر لحاظ سے ایک ناکام آپریشن تھا۔ وقت کا انتخاب، منصوبہ بندی اور عمل درآمد، سب کچھ غلط اور ناقص۔ نتیجہ زبردست نقصان کی صورت میں نکلا اور ہمارے کتنے دلیر افسر اور جوان بلا قصور مارے گئے۔

جنگ کے نقصانات ایک حد تک تو قابل قبول ہوتے ہیں لیکن جب حد سے بڑھ جائیں تو تباہی مقدر ہو جاتی ہے۔ فوجی کمانڈر، لڑنے والوں کی غیر ضروری اموات اور ان کے زخمی ہونے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور عام طور پر ان معاملات میں انہیں جواب دہی کرنی ہوتی ہے۔

دنیا کی توجہ کشمیر پر مرکوز رکھنے کے لئے ایسی چند جھڑپیں جو لائن آف کنٹرول تک محدود رہیں، شاید قابل قبول بات ہو۔ یہ بات وزیراعظم کو بھی معلوم تھی اور وہ بھارت سے اس معاملے پر مذاکرات میں بھی مصروف تھے اور شاید ان جھڑپوں نے جموں وکشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کی خواہش جنم دینے میں کوئی کردار بھی ادا کیا ہو۔

یہ بات انتہائی اہم ہے کہ کسی بھی فوجی آپریشن کو منصوبہ بندی سے پہلے ارد گرد کے حالات پیش نظر رکھے جائیں۔ جنرل مشرف اور ان کے قابل اعتماد رفقائے کار جنہوں نے اس آپریشن کی تجویز دی، اس حقیقت کو یکسر بھلا بیٹھے کہ امریکہ بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا تھا اور یہ بات بالکل واضح تھی کہ امریکہ پاکستان کی طرف سے ایسی مہم جوئی کی ہرگز حمایت نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں، وزیراعظم نواز شریف تعطل کو توڑنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے اور دونوں ملکوں کے درمیان فروغ امن کے لئے مذاکرات کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی جو بھارتی جنتا پارٹی اور متعصب ہندوؤں کے نمائندے تھے، نہ صرف لاہور کا

دورہ کر چکے تھے بلکہ انہوں نے مینار پاکستان کے قریب، عین اس جگہ خطاب بھی کیا جہاں قرارداد لاہور منظور ہوئی تھی اور بعد میں قرارداد پاکستان کہلائی۔ ان کے اس عمل سے واضح اشارہ ملتا تھا کہ بالآخر بھارت نے دو قومی نظریے کے مطابق تقسیم ہند کو قبول کر لیا ہے۔

وزیراعظم نواز شریف کے لئے یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی۔ لیکن عین اس وقت کارگل آپریشن کی نیو ڈالنا ایک بے سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ بھارت دنیا کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ تو علاقے میں امن کے فروغ کا خواہاں ہے جب کہ پاکستان ایک جنگجو قوم کا مسکن ہے اور بھارت سے امن کی کوششوں کو ناکام بناتا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس آپریشن کی ہمیں بھاری قیمت چکانا پڑی اور دنیا کے امن پسند لوگوں میں پاکستان بدنام ہو کر رہ گیا۔

ہمارے فوجی منصوبہ سازوں نے انتہائی اناڑی پن سے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ بھارت نے اپنی باقاعدہ فوج اور نیم فوجی دستوں کے پانچ لاکھ جوان مقبوضہ کشمیر میں تعینات کر رکھے ہیں اور جنگ کی صورت میں انہیں آسانی سے حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ ہمارے جن دستوں کو لائن آف کنٹرول کے پار بھیجا گیا اور جنہوں نے پہاڑی علاقوں میں چھوڑی گئی چوکیوں پر قبضہ کیا تھا، پاک فضائیہ کا تحفظ حاصل نہیں تھا۔ کسی چھوڑے ہوئے علاقے پر قبضہ کرنا تو آسان بات ہے لیکن پھر اس قبضے کو قائم رکھنا اور فوجیوں کو مناسب سامان رسد اور فضائی تحفظ مہیا کرنا ایک الگ بات ہے۔ صرف دو ہفتوں ہی میں سامان رسد ختم ہو گیا لیکن اس کے باوجود ہمارے فوجی دستے اس وقت تک قابض چوٹیوں پر ڈٹے رہے جب تک بھارت اپنے دستوں کو حرکت میں نہ لایا۔ بھارت نے نہ صرف اپنی فوج کو آگے بڑھایا بلکہ اپنی فضائیہ کی مدد بھی حاصل کی اور ہمارے فوجیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا جنہیں کوئی سائبان میسر نہ تھا۔

جدید ترین توپوں سے مسلح، بھارت کی چودہ رجمنٹوں نے ہمارے فوجیوں پر

گولے بارود کی بوچھاڑ کر دی جبکہ پیدل فوج کے دستے لہر در لہر آگے بڑھتے رہے اور ایک ایک کر کے وہ تمام چوکیاں خالی کرالیں جو ہمارے فوجیوں نے قائم کی تھیں۔ ہمارے معصوم فوجی زخمی مرغابیوں کی طرح مارے گئے۔ پاک فضائیہ کو اس آپریشن میں شاید اس لئے شریک نہیں کیا گیا تھا تاکہ یہ باور کرایا جا سکے کہ یہ پورا آپریشن کشمیری مجاہدین نے شروع کر رکھا ہے اور پاک فوج اس میں ملوث نہیں ہے۔ یہ انتہا درجے کی سادہ لوحی اور خوش گمانی تھی اور کوئی اس پر یقین نہ کرتا کہ اتنے وسیع پیمانے کا آپریشن پاک فوج کی مدد کے بغیر شروع کیا جا سکتا ہے۔ وسیع پیمانے پر جانی اموات اور زخمیوں نے اس کی تصدیق کر دی کہ یہ آپریشن پاک فوج ہی نے شروع کیا تھا اور اسی کی نگرانی میں ساری کارروائی عمل میں لائی گئی۔ اس معاملے میں قطعاً کوئی شک باقی نہ رہا۔

کارگل آپریشن جس کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ یہ ایک سو بیس کلومیٹر سے بھی بڑے محاذ پر پھیلا ہوا تھا، وزیراعظم اور کابینہ کی دفاعی کمیٹی کے علم میں لائے بغیر شروع کیا گیا تھا۔ بھارت نے نہ صرف محاذ جنگ پر اس کا بھر پور جواب دیا بلکہ سفارتی سطح پر بھی وہ زبردست مہم چلائی کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف کے ماتحت کام کرنے والے "چار کے ٹولے" کو اس کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ اس آپریشن کے منصوبہ سازوں کا یہ مفروضہ کہ سویلین محب وطن نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ اس آپریشن کی خبریں افشا کر دیں گے، درحقیقت انتہائی غلط تھا۔ جنرل مشرف کا یہ موقف کہ ہر شخص باخبر تھا، حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ وزیراعظم کبھی اس کارروائی میں فریق نہیں بن سکتے تھے جو ان مثبت نتائج پر پانی پھیر دے جو انہوں نے بھارت سے امن مذاکرات کے ذریعے حاصل کئے تھے۔

جب فوج کو اندازہ ہوا کہ بھارت بڑے بھر پور انداز میں جوابی کارروائی کر رہا ہے اور جانی اموات کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے تو جنرل مشرف کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ وزیراعظم کو اس بات پر آمادہ کریں کہ بھارت کو جنگ

کا دائرہ کار بڑھانے سے روکنے کے لئے امریکہ کی مدد حاصل کی جائے۔ نواز شریف کو لپک کر امریکہ جانا پڑا تاکہ صدر کلنٹن سے درخواست کریں کہ وہ بھارت کو جنگ کا دائرہ وسیع کرنے سے باز رکھیں اور پاکستانی دستوں کو قابض چوکیوں سے واپسی کا محفوظ رستہ دلوائیں۔ پاکستان کی درخواست مان لی گئی اور بھارت نے جوابی کارروائیوں کو وسعت دینے سے گریز کیا۔ جنرل مشرف نے اپنی کتاب "ان دی لائن آف فائر" میں جو دیگر حقائق مسخ کئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے" جو کچھ فوجی کارروائی میں حاصل کیا گیا تھا سفارتی محاذ پر گنوا دیا گیا۔" یہ پاکستان کے وزیراعظم سے سخت ناسپاسی اور ناشکرگزاری کا رویہ ہے۔ بدقسمتی سے نااہل فوجی کمانڈروں کا یہ خاصا رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی شکست کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے قبول نہیں کرتے اور اس بات کا تجزیہ کرنے کی بجائے کہ ان سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئیں، اپنی ناکامیاں دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کمانڈروں کی ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے آپریشن کے دوران بے تحاشا جانی اتلاف پر وسیع تحقیقات کا حکم دیا جاتا۔ بھارت نے جوابی کارروائیوں میں بھر پور کامیابی کے باوجود اپنے کمانڈروں سے ہونے والی غلطیوں کی بڑی باریک بینی سے چھان بین کی۔ تحقیقات ان کے نامور دفاعی تجزیہ نگار سبرامنیم کے سپرد تھیں۔ ان کے تجزیہ نگار اس نتیجے پر پہنچے کہ بھارت انٹیلی جنس کا مناسب نظام قائم نہیں کر سکا تھا۔ ان کی طرف سے یہ اہم ترین کوتاہی تھی۔ پاکستان میں ایسی کوئی تحقیق ہوئی نہ تجزیہ۔ ہمارا رجحان پردہ پوشی کا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں بھی ہم نے یہی کیا۔ جسٹس حمودالرحمٰن نے واضح طور پر ان افسروں کی نشاندہی کی تھی جو فوجی روایات سے انحراف کے ذمہ دار تھے۔ ایسے فوجیوں کو مثالی سزا ملنی چاہیے تھی۔ امریکیوں نے ویت نام میں شکست کے بعد ان وجوہات پر غور کرنے کے لئے تحقیقات کا اہتمام کیا تھا، جو شکست کا سبب بنیں۔ انہیں پتہ چلا کہ اس وقت کے سیکرٹری دفاع میکنامارا نے فوج میں تجارتی تنظیموں کی طرف سے "انسینٹیو سسٹم" (Incentive System) رائج کیا تھا جو ایک فاش غلطی تھی۔ تجارتی

تنظیموں میں کام کرنے والے لوگ مادی مفادات کی خاطر یقیناً محنت سے کام کرتے ہیں اور اچھے نتائج دیتے ہیں لیکن کوئی شخص تجارتی تنظیموں کے مفادات کے لئے اپنی جان نہیں دے سکتا۔ امریکی فوج نے یہ نظام بدل دیا اور پرانے آزمودہ طریق کار پر واپس چلے گئے اور اپنے افسروں اور جوانوں کی تربیت اس انداز میں منظم کی کہ ان میں حب الوطنی، باہمی اخوت، فرائض کی پابندی اور بالا کمانڈروں کی اطاعت کے احساسات پیدا ہوں۔ علاوہ ازیں ویت نام میں ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ سامنے آئی کہ افسروں کی ایک بڑی تعداد نشہ آور ادویات کی عادی تھی۔ انہوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اس بیماری کا مکمل تدارک کیا جائے۔ جو بات ہم باور کرانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ کسی بھی آپریشن کے غیر جانبدار تجزیے سے اہم سبق حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ کارگل آپریشن کے بارے میں بھی نامور، غیر جانبدار فوجی کمانڈروں اور دفاعی تجزیہ نگاروں کے ہاتھوں تحقیقات کروائی جائیں۔

کرنل اشفاق حسین نے اپنی کتاب "وٹنیس ٹو بلنڈر" میں پوری سچائی سے آپریشن کے وہ واقعات بیان کر دیے ہیں جو ان کے ذاتی علم میں آئے۔ یہ کتاب ایک متوازن مطالعہ ہے اور اس میں وہ گفتگو بھی شامل ہے جو اس آپریشن کے منصوبہ سازوں کے درمیان ہوتی رہی۔ کارگل آپریشن پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس کتاب کا منفرد پہلو یہ ہے کہ یہ ان اطلاعات پر مبنی ہے جو مصنف نے ان لوگوں سے براہ راست رابطہ کر کے حاصل کیں جنہوں نے اس آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ واقعات کے بیان میں مکمل سچائی اختیار کی گئی ہے جو بھرپور تحقیقات اور آپریشن کے جائزے کے لئے مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک قابل تحسین کوشش ہے۔ فوجی ادب کے شوقین طلبہ اور عام قارئین کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن پی ایچ ڈی۔ یو۔ ایس۔ اے
سابق مشیر سائیکولوجیکل آپریشنز
جی۔ ایچ۔ کیو۔ راولپنڈی

تعارف

بیسویں صدی خونریز جنگوں کی صدی تھی۔ ریاستوں کی باہمی چپقلش اور منافرت نے ایسی سینکڑوں جنگوں کو جنم دیا جنہوں نے انسانیت کو خون میں نہلا دیا اور ان جنگوں نے وہ زبردست تباہی پھیلائی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اور ہمیں اس صدی کی آخری جنگ جو تنازعہ کارگل کے نام سے جانی جاتی ہے، لڑنے کا منفرد "امتیاز" حاصل ہے۔ حربی لحاظ سے محدود اور بے مقصد ہونے کے باوجود سانحہ کارگل، ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ متنازعہ اور المناک واقعہ ہے۔

یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ تنازعہ کارگل "کشمیری عسکریت پسندوں" اور پاکستانی فوجی دستوں کی طرف سے بلندیوں پر واقع اس لائن آف کنٹرول کو عبور کرنے کی وجہ سے پیش آیا جو اب تک دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کے طور پر کام دیتی رہی ہے۔ اس بحران کے دوران پاکستان کا موقف یہ رہا کہ کارگل کی اگلی چوکیوں پر قبضہ مجاہدین کا کام ہے۔ کسی نے ہماری بات پر یقین نہیں کیا۔

اس واقعے کے بارے میں بہت سی کتابیں اور بیانات شائع ہوئے ہیں۔ ہر ایک نے مختلف انداز اختیار کیا ہے۔ ان بیانات سے تنازعے میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور معاملہ مزید پراسرار ہوگیا۔ لیکن جنرل پرویز مشرف کی کتاب "ان دی

لائن آف فائر'' کے بعد یہ تنازعہ کوئی راز نہیں رہا۔ انہوں نے نہ صرف اس عام تاثر کی تصدیق کر دی ہے کہ وہی اس بے سند منصوبے کے اصل معمار تھے بلکہ یہ بھی مان لیا ہے (صفحہ ۸۷) کہ پاک فوج اکتوبر ۱۹۹۸ء سے ان تیاریوں میں مصروف تھی جسے انہوں نے دفاعی اور احتیاطی تدابیر کا نام دیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرف صاحب نے یہ دعویٰ کر کے اپنے اصل عندیے کا اظہار کر دیا ہے (صفحہ ۹۶،۹۵) کہ ''کسی جارحانہ آپریشن کی باقاعدہ منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی، لائن آف کنٹرول پر خالی جگہوں کے درمیاں نقل و حرکت کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں تھی اور جو کچھ بھی کیا گیا وہ مقامی کمانڈروں کے دائرہ اختیار میں آتا تھا''۔ شاید وہ درست کہتے ہوں لیکن اس معاملے میں ایسا لگتا ہے کہ مقامی کمانڈر، جو نئے نئے میجر جنرل بنے تھے، اور اپنی اعلیٰ تعلیمی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھے، عملی تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے نظری تعلیمات میں الجھ کر رہ گئے اور اس آپریشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خطرات کا احاطہ نہ کر سکے۔ انہوں نے جو سوچا اس پر عمل شروع کر دیا اور اس کا احساس نہ کیا کہ فریق مخالف بھی جوابی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ظاہر ہے معاملات ہاتھ سے نکل گئے۔

سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ جنرل مشرف نے کارگل کی کہانی بیان کرتے ہوئے اپنی ناقص منصوبہ بندی اور عاقبت نا اندیش آپریشن کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کارگل آپریشن کو پاک فوج کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل قرار دیا ہے۔ کوئی معقول شخص ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ پوری دنیا کارگل کے بارے میں مختلف رائے رکھتی ہے۔ فوج کے سینئر ترین افسر بھی اس اس آپریشن پر معترض ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) علی قلی خان، پرویز مشرف کی بطور چیف آف آرمی سٹاف تقرری کے وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ انہوں نے پرویز مشرف کی کتاب کے جواب میں کارگل کے واقعے کو پاکستان کی تاریخ کا بدترین

سانحہ قرار دیا۔ انہوں نے لکھا، ''بے شمار معصوم جانیں بلا مقصد ضائع کر دی گئیں''۔ جنرل علی قلی خان نے اس عام تاثر کی بھی تصدیق کی ہے کہ کارگل آپریشن کی مجموعی صورت حال کا احاطہ نہیں کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف پاکستان کی رسوائی ہوئی بلکہ کئی معصوم لوگ اور ان کے خاندان بے ضرورت، شدید مشکلات کا شکار ہو گئے۔

اس منصوبے کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ بین الاقوامی صورت حال کو قطعاً پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی اصولوں سے روگردانی کی گئی اور بین الاقوامی ردعمل نے اس بارے میں کوئی شک نہیں رہنے دیا۔ اس صورت حال میں کوئی سیاسی قیادت یا سفارتی تدبیر بین الاقوامی رائے کو تبدیل نہیں کر سکتی تھی اور نہ بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالا دے سکتی تھی۔ پرویز مشرف کا یہ دعویٰ کہ ''فوجی فتوحات'' کو ''سفارتی شکست'' میں بدل دیا گیا حقائق سے انحراف ہے اور اس ذہنیت کا عکاس ہے جو تدبیراتی سوچ سے عاری اور اپنی غلطیوں کے الزام دوسروں کے سر تھوپنے کی متلاشی ہو۔

کارگل سے ہمیں حاصل کیا ہوا ؟ اس کا صحیح جواب تو تاریخ ہی دے گی۔ کارگل کو کسی بھی نقطہ نظر سے دیکھیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پاکستان کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا، اور اس سے پاک بھارت تعلقات پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس وقت پاکستان کے امور خارجہ کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے اتنا ہی کہوں گا کہ دنیا کے کسی فارن آفس کو اتنے بحرانی حالات میں اتنے ناممکن کام کا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔

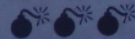
سفارتی محاذ پر ہم نے بین الاقوامی برادری کے منفی ردعمل کا توڑ کرنے کی اپنی سی کوشش کی لیکن دنیا نے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ لائن آف کنٹرول کے پار دراندازی کو پاکستان ہی کے کھاتے میں ڈالا۔ بڑی طاقتوں نے جنہیں سیٹلائٹ کے ذریعے مشاہدے کی جدید ترین سہولتیں حاصل ہیں، ہم پر دراندازی کا الزام لگایا اور وہ

اس تشویش میں مبتلا ہوئے کہ کہیں ایٹمی جنگ نہ چھڑ جائے۔ ان بین الاقوامی
خدشات کے پیش نظر کارگل صرف پاک بھارت معاملہ نہیں رہ گیا تھا۔ پوری دنیا بجا
طور پر متفکر تھی اور ہم سے واپسی کے لئے کہا گیا۔ حتمی طور پر سیاسی قیادت نے صورت
حال کی سنگینی کو کم کر کے جنگ کا دائرہ کار بڑھنے کے خطرے کو ٹالتے ہوئے قومی مفاد
میں مناسب کردار ادا کیا۔

کرنل (ر) اشفاق حسین نے آئی ایس پی آر میں رہتے ہوئے اپنے ذاتی
تجربات کو دلچسپ واقعات کی لڑی میں پرو کر شاندار خدمات انجام دی ہے۔ یہ کتاب
جو بہ یک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہو رہی ہے، پاکستانی عوام کو یہ بتانے کی
بے لاگ اور بے باک کوشش ہے کہ کارگل میں دراصل ہوا کیا اور اس مہم کی منصوبہ
بندی کتنی ناقص تھی، اس پر عمل درآمد میں کتنی کوتاہیاں ہوئیں۔ اس سانحے کے رئیسی
کردار کون تھے اور کس طرح ہمارے گمنام ہیرو اور بہترین سپاہی ایک بے مقصد کوشش
میں ضائع ہو گئے۔

شمشاد احمد خان

سابق سیکرٹری امور خارجہ پاکستان



دو کارگل......ناکام فوجی مہم جوئی اور سیاسی بربادی

کارگل اب کشمیر کی پہاڑی چوٹیوں کے کسی مجموعے کا نام نہیں رہا بلکہ ناکام فوجی
مہم جوئی اور ہمالیہ جیسی ہولناک سیاسی تباہی کی علامت بن چکا ہے۔ بہت کم لوگوں کو
معلوم ہے کہ دسمبر ۱۹۹۸ء سے اپریل ۱۹۹۹ء کے دوران کارگل کے علاقے میں کیا ہوتا
رہا۔ اس دوران بھارت کی فوجی اور سیاسی قیادت نے خود کو ایک خطرناک صورت
حال میں پایا۔ ابتدا میں تو وہ بوکھلاہٹ اور تعجب میں مبتلا تھے لیکن پھر انہوں نے پوری
قوت سے جوابی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ یوں لائن آف کنٹرول کے پار، تزویراتی اہمیت
کی حامل چند اہم بلندیوں پر قبضے کے جس عمل سے تدبیراتی چالوں کے مطابق اہم
کامیابیوں کی توقع تھی اور جو ایک طرح سے اس بھارتی مہم جوئی کا ترکی بہ ترکی جواب
تھا جو اس نے ۱۹۹۴ میں سیاچن میں کی تھی، ایٹمی ہتھیاروں سے لیس دو ہمسایوں کو
مکمل جنگ کے قریب لے آیا۔ اس عمل نے ان "امن فروغ" بلند بانگ کارروائیوں
کا بھی خاتمہ کر دیا جو مارچ ۱۹۹۹ء میں بھارتی وزیر اعظم کے پاکستان کے دورے اور
اعلان لاہور پر دستخط سے شروع ہوئی تھیں۔

پاکستان کی سیاسی قیادت گرچہ پورے واقعے سے بے خبر رہی لیکن پھر بھی اس
نے اس واقعے سے ہونے والے نقصانات کے ازالے کے لئے امریکی صدر بل کلنٹن

کی مدد سے اپنی سی کوشش کی اور مجرمانہ، کمزور پوزیشن سے مذاکرات کے ذریعے اس دلدل سے نکلنے کا راستہ نکالا۔ شرمندگی سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ غیر مشروط فوجی دستوں کی واپسی پر اتفاق کرنا پڑا یوں وہ ''شاندار عسکری تدبیر'' جسے اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے مبینہ طور پر دشمن پر ایسی کاری ضرب قرار دیا تھا جو وہ کبھی نہ بھول سکے گا، ایک تباہ کن فوجی ناکامی اور سیاسی طور پر فاش غلطی ثابت ہوئی۔

پاک فوج اپنے کئی بہترین افسروں اور جوانوں سے محروم ہوگئی پاک فوج کی قیادت کی تزویراتی بصارت، تدبیراتی صلاحیت اور پیشہ وارانہ مہارت کو سخت دھچکہ لگا۔ سیاسی سطح پر پاکستان کی رسوائی ہوئی اور اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس کے باوجود کہ بھارت نے بڑی کامیابی سے ہماری فوجی کارروائی کا رخ پھیرا اور بین الاقوامی سطح پر اپنی پوزیشن بہتر بنائی، اس نے کارگل کے واقعے اور اپنی ناکامیوں پر تحقیقاتی عدالتیں قائم کیں۔ جس کے نتیجے میں سیاچن کور کے کمانڈر کو برطرف کیا گیا۔ دوسری طرف پاکستان میں ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کہاں، کب، کیا غلطیاں ہوئیں اور اس سانحے کے ذمہ دار کون تھے۔ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ اپنے قیام سے اب تک ہونے والے کسی سانحے کے ذمہ داروں کا تعین ہو سکا نہ محاسبہ، چاہے وہ سویلین تھے یا فوجی۔ اب بھی ایک غیر جانبدار، اعلیٰ اختیاراتی تحقیقات کی ضرورت باقی ہے۔ اس طرح کی تحقیقات کے مطالبے شدت اختیار کر رہے ہیں۔ نئی سیاسی قیادت کی طرف سے ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ تاہم ایک باضمیر اور باخبر افسر، کرنل اشفاق حسین نے سانحہ کارگل پر اپنے طور پر تحقیقات کر کے اپنے حصے کا کام سرانجام دیا ہے۔ ان کی کتاب ''وٹنیس ٹو بلنڈر'' چشم کشا بھی ہے اور اس قومی سانحے کے بہت سے اہم پہلوؤں کا گہرا تجزیہ بھی۔ یہ حقائق سے بھرپور کتاب ہے۔ انداز اور پیشکش معروضی ہے اور یہ بات حیران کن ہے کہ کس باریک بینی سے

انہوں نے مختلف مناظر اور واقعات میں تسلسل پیدا کر کے اس طرح بیان کیا ہے کہ حقائق بے نقاب اور دیو مالائی اسرار منکشف ہوں۔ گرچہ پریس میں اس موضوع پر چند تجزیاتی مضامین اور تشویش ناک بیانات شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ پہلی عرق ریز، منظم کوشش ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کارگل میں کیا ہوا اور اس کی ہمیں کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔

کرنل اشفاق نے گزشتہ عشرے کے اس اہم ترین واقعے کی یہ رپورٹ لکھ کر پاک فوج اور پاکستانی قوم کی ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔ انہوں نے کم وبیش وہ سب کچھ بیان کر دیا ہے جو قوم کو بتانے کی ضرورت تھی اور پورے آپریشن کو لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔ تاہم انہوں نے نتائج اخذ کرنے اور سفارشات پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔ ان کے بیان کردہ حقائق اور مختلف واقعات کی منظرکشی سے میرے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوئے، انہیں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

فوجی قیادت نے فرض کر لیا تھا کہ کارگل ایک ''محدود آپریشن'' ہوگا اور اس سے کشمیر کو فلیش پوائنٹ کے طور پر اجاگر کرنے میں مدد ملے گی۔ سوچا یہ گیا تھا کہ مکمل جنگ کا خطرہ مول لئے بغیر، بھارت کو ایک زبردست ناموافق صورت حال میں مبتلا کر دیا جائے گا۔ بھارت کی طرف سے بھرپور جوابی کارروائی کی صورت میں کوئی جامع منصوبہ نہیں بنایا گیا تھا۔ ناقابل یقین ہے کہ وہ فوجی قیادت جس سے وسیع تر تزویراتی حکمت اور عسکری بصارت کی توقع تھی اس قدر کھوکھلے اور ادھورے منصوبے پر عمل پیرا ہوگی۔ بین الاقوامی جغرافیائی، سیاسی صورت حال کو بڑی خوش گمانی سے نظر انداز کیا گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے تجربات کو یکسر بھلا دیا گیا۔ جوابی کارروائی کی صورت میں متبادل منصوبہ کیا ہوگا، مکمل جنگ چھڑنے کی شکل میں حکمت عملی کیا ہوگی، آپریشن کی کامیابی اور اس کے ممکنہ نتائج اور ناکامی کی صورت میں پسپائی کی تدابیر، ان سب باتوں پر قطعاً غور خوض نہیں کیا گیا۔

دوسری بات یہ کہ فوجی اور سیاسی سطح پر با معنی مشاورت اور رابطوں کا فقدان
تھا۔ دوسری سروسز کے سربراہ اس آپریشن سے بے خبر تھے۔ یہ بات ناقابل یقین ہے
کہ آپریشن شروع کر دیا گیا اور انتہائی نازک مرحلے میں داخل ہونے کے باوجود
فضائیہ کو اس میں شامل نہیں کیا گیا حالانکہ اس طرح کے آپریشن میں فضائیہ کو جزو
لاینفک ہونا چاہیے تھا۔ ان کا کردار مختصر ہوتا یا وسیع تر۔ اس آپریشن کے متعلق اہم
فیصلوں کے وقت سیاسی قیادت کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اس نوعیت کا آپریشن،
جس کے مکمل جنگ تک پھیل جانے کا خدشہ ہو، مسلح افواج کا کوئی سربراہ یا اس کے
چندساتھی اپنے طور پر شروع نہیں کر سکتے۔ سیاسی ادب میں یہ بات مسلم ہے کہ جنگ
اتنا اہم معاملہ ہے کہ اسے جرنیلوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ صرف سیاسی قیادت اور بعض
ممالک میں پارلیمنٹ ہی وہ واحد ادارہ ہے جو جنگی کارروائیوں کی منظوری دے سکتی
ہے۔ آئینی فیصلہ سازی کے اس عمل سے قطعی انحراف اور ملک میں موجود کمانڈ اینڈ
کنٹرول سسٹم سے روگردانی ان لوگوں کی ایک اہم ناکامی تھی جنہوں نے کارگل
آپریشن کا فیصلہ کیا۔

تیسری بات یہ کہ روز بروز ہونے والے واقعات اور مئی سے جولائی ۱۹۹۹ء
تک ہونے والی تباہ کاریوں سے جو مجموعی صورت حال سامنے آتی ہے، اس سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس آپریشن کی منصوبہ بندی ناقص، انتظامات بے تدبیر اور منتشر
سے دور دراز قائم کی گئی چوکیوں کے درمیان رابطے انتہائی کمزور تھے۔ یہ بات اذیت
ناک ہے کہ کس طرح ہمارے قیمتی افسر اور جوان ہوسناک مہم میں توپوں کے ایندھن
کے طور پر استعمال کئے گئے جنہیں مشن کے بارے میں مناسب بریفنگ دی گئی نہ بتایا
گیا کہ اس سب کچھ کا کیا مقصد ہے۔ انہیں مناسب وسائل مہیا کئے گئے نہ
سازوسامان، خوراک، افرادی قوت اور نہ ہی زخمیوں کی واپسی کا کوئی بندوبست کیا
گیا۔ یہ بات ناقابل یقین ہے کہ جنگ کے مختلف مرحلوں میں مختلف صورتوں جیسے

پیش قدمی، دائرہ جنگ کی وسعت، استحکام، تاخیر یا ناقابل گریز پسپائی کی شکل میں
فوری، موثر اور وافر مقدار میں وسائل کی فراہمی کے انتظامات پر غور کئے بغیر اس طرز کا
آپریشن شروع کر دیا گیا اور نازک لمحات میں کس طرح اہم فیصلے انہی مجاہدوں پر چھوڑ
دیے گئے جو چاروں جانب سے دشمن کے گھیرے میں تھے، جن کے پاس اسلحہ باقی رہ
گیا تھا نہ خوراک۔ ان کی بہادری، شجاعت، ہنرمندی، ایثار وقربانی اور استقلال کو
سلام۔

جہاں اس آپریشن کی تباہ کن ناکامی اور فوجی قیادت کی نااہلی اور بے حسی سے
گہری تشویش ہوتی ہے وہاں ان افسروں اور جوانوں کی شجاعت، استقلال، اختراع
پسندی اور پیشہ وارانہ مہارت کو دیکھ کر امید کی کرن پیدا ہوتی ہے اور حوصلہ بحال ہوتا
ہے جنہوں نے اپنے اللہ اور قوم سے کیا ہوا عہد نباہتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر
دیں۔ یہ بات ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ اصل قوت مقاومت انہی افسروں اور
جوانوں کی خود سپردگی، ایثار پسندی، حب الوطنی، جذبہ جہاد سے سرشاری اور شہادت
کی تمنا تھی۔ انہی جذبات نے افسروں اور جوانوں کو خطرناک ترین صورت حال میں
سہارا دیا۔ جب موت ان کے سامنے تھی تب بھی وہ آخری سانس تک لڑنے کے عزم
سے سرشار اور آزمائش کی ان گھڑیوں میں اپنے ساتھی مجاہدوں کی مدد کے لئے تیار
تھے۔ درمیانی رینک اور جونیئر افسروں اور جوانوں کی کارکردگی مثالی اور اعتماد آفرین
ہے۔ اسی میں ہماری مسلح افواج اور قوم کی اصل قوت پنہاں ہے۔ میں یہ کہنے میں کوئی
جھجک محسوس نہیں کرتا کہ کرنل اشفاق کے بیان کے سب سے زیادہ موثر اور دل گداز
واقعات، افسروں اور جوانوں کی عسکری مہارت، معاملہ فہمی، زیرکی، شجاعت کی اعلیٰ
کارکردگی، اخلاق اور روحانی بالیدگی سے متعلق ہیں۔ کیپٹن شیر، میجر عبدالوہاب، کیپٹن
عبدالمالک اور میجر طارق محمود کی تابندہ مثالیں ہماری تاریخ اور روایات کی بہترین
عکاس ہیں۔ وہ اس جدوجہد میں اصل ہیرو کے طور پر ابھرتے ہیں۔ وہ قومی روایات

کی علامت اور آنے والی نسلوں کے لئے چاہے وہ فوجی ہوں یا شہری، قابل تقلید نمونے ہیں۔ یہ کتاب ایک آئینے کی طرح ہے۔ جہاں افسروں اور ان کے ساتھیوں کی روح کو سرشار کر دینے والی اعلیٰ اخلاقی کردار کی مثالیں مسلح افواج پر ہمارے ایمان کو پختہ اور ہمارے ارادوں کو استحکام بخشتی ہیں وہاں یہ آئینہ ان چار جرنیلوں کی ایک تشویش ناک شبیہہ بھی دکھاتا ہے جو ناکام ہو کر بھی نہ صرف سروس میں رہے بلکہ پھلتے پھولتے رہے۔

اس واقعے کے ان نتائج سے قوم کو غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ جہاں ہمیں اپنی مسلح افواج، جن پر ہماری آزادی، خودمختاری اور قومی وقار کا انحصار ہے، کی قوت کے اصل ذرائع کا ادراک ہونا چاہیے، وہاں معروضی طور پر ان عوامل اور افراد کا تعین کرنے کی بھی ضرورت ہے جو ہماری کمزوریوں اور ناکامیوں کا سبب بنے۔ ہم اس پہلو کو بھی نظر انداز کر سکتے ہیں جب ایک قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو درپیش خطرات سے بے نیاز ہوں۔ یہ مسلح افواج کی اعلیٰ سطح کی پوری قیادت کے بارے میں رائے نہیں ہے لیکن اس سانحے کے لئے ان لوگوں کو تو جواب دہی پر مجبور کیا جانا چاہیے جو اس اعتماد پر پورے نہیں اترے، جو قوم نے ان پر کیا تھا۔

کرنل اشفاق نے اس غیر معمولی کتاب کا اختتام ایک ایسے باب پر کیا ہے جسے انہوں نے ''طویل ترین دن'' یعنی ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کا نام دیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ صرف طویل ترین دن ہی نہیں تھا بلکہ فوجی حکمرانی اور وردی والی آمریت کی طویل ترین رات میں بھی بدل گیا۔ کارگل نے ملکی سیاست پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس سے اس اعتماد اور بھروسے کو سخت دھچکہ لگا جو سیاسی اور عسکری قیادت کے درمیان اہم ترین ارتباطی قوت ہے۔ وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کے درمیان جو خوشگوار تعلقات ظاہر کئے جا رہے تھے، وہ دیرپا ثابت نہ ہوئے اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو یہ اپنے اختتام کو پہنچے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ دوسرے سانحے میں بھی کارگل کی ساری

بنت شامل ہے۔ اس باب میں جو تفصیلات دی گئی ہیں، وہ سانحہ کارگل کے سارے عناصر کو از سر نو ظاہر کرتی ہیں۔ وزیراعظم نے عسکری قیادت کی تباہ کن ناکامی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ان کے سارے عمل، نشر مکرر نظر آتے ہیں۔ انہیں اس کارروائی کے وسیع تر نتائج وعواقب کا قطعاً احساس نہ ہوا جو حالات کو موافق بنانے کی تیاری کے بغیر چیف آف آرمی سٹاف سے براہ راست تنازعہ مول لینے کی صورت میں پیش آسکتے تھے۔ کوئی مشاورت نہیں کی گئی، ان سے بھی نہیں جو ان کے بہت قریب تھے اور بآسانی دستیاب تھے۔ ضرورت سے زیادہ اعتماد، من موجی فیصلے اور، مناسب منصوبہ بندی کا فقدان اور ناموافق حالات سے بے نیازی۔ اس اپریشن میں بھی منصوبہ بندی ناقص تھی اور نفاذ میں بے تدبیری نمایاں۔ اگر مئی اور جون میں ملک کو جنرل پرویز مشرف کے کارگل نے اذیت سے دوچار کیا تو ۱۲ اکتوبر نواز شریف کے ''کارگل'' کی نمائندگی کرتا ہے۔ جولائی ۱۹۹۹ء میں سیاسی قیادت نے چیلنج کا سامنا کیا اور سیاسی شرمندگی کا خطرہ مول لے کر بحران کو حل کرنے کی مشکل ذمہ داری کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۲ اکتوبر کے ''کارگل'' میں بھی بحران کے حل کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ سیاسی قیادت اس جال میں پھنس گئی جو فوجی قیادت نے پھیلایا تھا۔ کسی نے بھی ان اداروں کے تحفظ کی کوشش نہ کی جو معاشرے اور ریاست کو قائم رکھتے ہیں۔ ملک، ذاتی حکمرانی کی سیاہ رات کی تاریکیوں میں ڈوب گیا اور قومی ادارے مکمل تباہ نہیں ہوئے تو کمزور ضرور ہو گئے۔

دونوں کارگل کے درمیان مماثلت ہے یا نہیں، اس کے بارے میں تو کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن دونوں کارگلوں سے اخذ کیا جانے والا نتیجہ بالکل واضح ہے۔ کارگل جیسے سانحے اس وقت تک ختم نہیں ہوں گے جب تک قوم مہم جو افراد اور غاصبوں سے جو کسی بھی رنگ یا نسل کے ہوں خود کو بچانے اور اپنے اداروں کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑی نہیں ہوتی۔ آئندہ کارگل جیسے واقعات سے بچنے کا واحد

راستہ، قانون کی حکمرانی، اداروں کے ہاتھوں میں فیصلوں کا اختیار اور شفاف احتساب ہی ہے۔ ''وٹنس ٹو بلنڈرز'' ایک ایسی تحقیقاتی رپورٹ ہے جس میں ہمارے قومی سانحے کے کچھ پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ایک دعوت ہے کہ ملک کو مستقبل کی مہم جوئی اور مہم جو افراد سے تحفظ کے لئے ضروری اور موثر اقدامات کئے جائیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے گھر کے حالات سدھاریں۔ اس سے زیادہ تباہ کن بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اتنے وسیع پیمانے کی قومی تباہی کے ذمہ دار افراد کو معاف کر دیا جائے۔ جو مجرم ہیں ان کا مکمل احتساب ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ جو تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتے، انہیں تاریخ کے رحم و کرم پر سسکنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر وہ ان سزاؤں کے منتظر رہتے ہیں جو عبرت نہ حاصل کرنے والوں کا مقدر ہیں۔

سینیٹر پروفیسر خورشید احمد

۱۱ جولائی ۲۰۰۸



عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں

کارگل کے معاملے پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ اچھی ہیں اور کچھ بے نیازی سے لکھی گئی ہیں۔ ان کی موجودگی میں یہ سوال بجا ہے کہ اس موضوع پر کسی نئی کتاب کی کیا ضرورت ہے؟ کرنل اشفاق حسین کی یہ کتاب اس المناک واقعے کے نئے پہلوؤں سے روشناس کرواتی ہے، جس نے پاکستان کو کئی نتائج بد میں مبتلا کیا۔ اس میں وہ حقائق بیان کئے گئے ہیں جو کارگل کی جنگ میں شریک افسروں اور جوانوں سے براہ راست انٹرویو کر کے حاصل کئے گئے اور جن سے اس آپریشن کے منصوبہ ساز سینئر افسروں کی منافقت اور حماقت بھی بے نقاب ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح وہ افسر اور جوان جن میں کچھ پاک فوج کا بہترین سرمایہ تھے، غلط حکمت عملی کی بھینٹ چڑھا دیے گئے۔

''وٹنس ٹو بلنڈرز'' دو جمع دو چار کی طرح، جو بات بالکل واضح کرتی ہے، یہ ہے کہ اگر اس آپریشن کی اس وقت بھی کوئی تک نہیں بنتی تھی جب یہ روبہ عمل لایا گیا، تو اب یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ ایک مجرمانہ فعل تھا۔ اس کے باوجود، بجائے اس کے، کہ اس سانحے کے ذمہ دار افراد کا احتساب کیا جاتا، وہ ترقی کے زینے پر چڑھتے گئے اور اس کے رئیسی کردار چیف آف آرمی سٹاف، بعدازاں

صدر پاکستان، جنرل پرویز مشرف
ساڑھے آٹھ برس تک ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔

حقائق انتہائی تلخ ہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے فوج کا سربراہ مقرر ہونے کے فوراً بعد لائن آف کنٹرول عبور کرنے اور اس پار، ان بلندیوں پر قبضے کی منظوری دی جو بھارتی فوج ہمالیہ کے طویل موسم سرما کی منجمد کر دینے والی سردیوں کے دوران خالی کر دیا کرتی تھی۔ اس آپریشن سے کیا حاصل کرنا مقصود تھا؟ اس سے ہمیں کیا تزویراتی فائدہ حاصل ہوتا؟ یہ کس بڑے منصوبے کا پیش خیمہ تھا؟ ان سوالوں کے واضح جواب نہ اس وقت ملے جب یہ سانحہ رونما ہوا اور نہ بعد کے برسوں میں مل پائے۔ صدر مشرف نے کرایے پر لکھوائی ہوئی کتاب "ان دی لائن آف فائر" میں اس سانحے کی جو وضاحت پیش فرمانے کی کوشش کی ہے، حقائق پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے اور تاریخ میں کبھی معتبر قرار نہ پائے گی۔

مصنف کی رائے میں اس سانحے کے اصل منصوبہ ساز، فورس کمانڈ ناردرن ایریا کے کمانڈر، میجر جنرل جاوید حسن تھے۔ چیف آف جنرل سٹاف، لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان اور ۱۰ کور کے کمانڈر، لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد نے ان سے اتفاق کیا۔ کیا جنرل مشرف خود کو فاتح کشمیر کہلوانا چاہتے تھے؟ ہمیں کبھی اس کا پتہ نہ چل سکے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب انہیں یہ منصوبہ پیش کیا گیا تو انہوں نے فوراً اس کی منظوری دے دی۔ انہوں نے مستند سول انتظامیہ کے سربراہوں کو اطلاع دینے کی زحمت گوارا نہ فرمائی جو اس وقت تک منصوبے سے بے خبر رہے، جب تک معاملات ہاتھ سے نکل نہیں گئے۔ ملک کو ایسی جنگ میں پھنسا دیا گیا تھا جسے جیتنے کی کوئی امید نہ تھی اور جسے بھارت ہارنے کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

فوجی دستوں نے دسمبر ۱۹۹۸ء میں پہلی بار لائن آف کنٹرول عبور کی۔ اس کے بعد، مختلف مقامات پر دستوں کی تعیناتی، بلندیوں پر قبضے اور دفاعی مورچوں کو مستحکم

کرنے کا عمل جاری رہا جب کہ بھارتی فوج ان اقدامات سے قطعاً بے خبر رہی۔ خود ساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے ۱۹۶۵ء میں کمانڈو دستے کشمیر میں اس امید پر بھیجے تھے کہ مقبوضہ علاقے کو آزاد کروا لیا جائے گا۔ جو انہوں نے سوچا نہیں تھا وہ بین الاقوامی سرحدوں پر مکمل جنگ تھی اور ان کی تزویراتی، فاش غلطی کا جواب بھارت نے اسی جنگ کی صورت میں دیا۔ کیا جنرل مشرف کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ مکمل غور و خوض کئے بغیر لائن آف کنٹرول کے پار ایک اور مہم جوئی کے ارتکاب سے وہ ماضی کے بھوتوں کو جگانے کا سبب بنیں گے۔ جس بے فکری اور لاپرواہی سے کارگل آپریشن کی منصوبہ بندی کی گئی اور جس بے تدبیری سے اس پر عمل کیا گیا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی کوئی بات ان کے حاشیہ خیال سے نہیں گزری۔

بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی، فروری ۱۹۹۹ء میں، امن کا پیام لئے، اس نفرت اور کشیدگی کو ختم کرنے کی کوشش میں، جو دونوں ملکوں کے درمیان مئی ۱۹۹۸ء میں بھارت کے ایٹمی دھماکے کرنے سے پیدا ہوئی تھی، مشہور زمانہ بس سروس کے ذریعے لاہور روانہ ہوئے۔ کیا یہ بات قابل معافی ہے کہ جب سفارتی محاذ پر ہم، اہم کامیابی حاصل کر رہے تھے، پاکستان کا نیا مقرر کردہ فوجی سربراہ، اس کے برعکس کارروئیوں میں مصروف تھا۔

بھارت کو لائن آف کنٹرول کے پار دراندازی کی خبر مئی ۱۹۹۹ء کے اوائل میں ہوئی۔ واجپائی نے محسوس کیا کہ ان سے بے وفائی کی گئی ہے۔ انہوں نے فون کر کے اپنے ہم منصب نواز شریف سے کہا کہ ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف واجپائی ہی سے بے وفائی نہیں کی گئی تھی بلکہ پاکستان کی شہری قیادت سے بھی بے وفائی کی گئی تھی۔ جب مشرف سے پوچھا گیا تو عجلت میں ۱۲ مئی کو راولپنڈی کے اوجڑی کیمپ میں ایک بریفنگ کا اہتمام کیا گیا۔ اس وقت کارگل کی بلندیوں پر شدید جھڑپیں جاری تھیں۔ دونوں جانب سے دلیر فوجی، شجاعت اور ایثار

کے بے مثال مظاہرے کرتے ہوئے، اپنی جانیں قربان کر رہے تھے۔ پاکستان کی سیاسی قیادت کو اس وقت یہ پتہ چلا کہ کارگل آپریشن سے متعلق کمانڈر کیا کر بیٹھے ہیں۔

"قطعی بے خبری اور لاعلمی" کو اس آپریشن کی کہاوت قرار دیا جا سکتا ہے۔ محض واجپائی اور نواز شریف ہی اس سے بے خبر نہیں، تھے پاک فوج کے بیشتر کور کمانڈر، فضائیہ اور بحریہ کے سربراہ بھی اس سے لاعلم رہے۔ جنرل مشرف نے سب کو مبہوت کر کے مکمل "سرپرائز" حاصل کیا۔

بڑی حد تک، کارگل کی منصوبہ بندی، اس پختہ یقین پر کی گئی تھی کہ جب بھارتی فوج کو دراندازی کی خبر ہو گی تو وہ اس بارے میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو گی۔ بہت جلد یہ ثابت ہو گیا کہ یہ کس قدر احمقانہ مفروضہ تھا۔ جب بھارتی فوج نے جوابی کارروائی شروع کی تو یہ شدید بھی تھی، خشمناک بھی۔ ایک ایک چوکی پر بھاری بمباری کی گئی۔ پیدل فوج نے لہر در لہر حملے کئے۔ بھارتی فوج کا سخت جانی نقصان ہوا لیکن حملوں میں کمی نہ آئی۔

ناردرن لائٹ انفنٹری، کارگل آپریشن میں حصہ لینے والی اہم ترین رجمنٹ تھی۔ اس کے افسر اور جوان مردانہ وار لڑے لیکن حالات ناموافق تھے، دشمن کو ان پر عددی برتری بھی حاصل تھی اور ان کا سامان رسد بھی محدود تھا۔ یہ ایک ایسا آپریشن تھا جو یقینی فتح کے مفروضے پر مبنی تھا۔ شکست کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی حالانکہ ناقص مفروضوں کی وجہ سے شکست تو ہونا تھی اور وہ ہوئی۔

"وِٹنس ٹو بلنڈر" ۵، ۶، ۱۲ ناردرن لائٹ انفنٹری اور دوسری یونٹوں کے بارے میں ایسی تفصیلات بیان کرتی ہے جو کم از کم میں نے کسی اور کتاب میں نہیں دیکھیں۔ یہ وہ یونٹ تھے جنہوں نے جنگ کی سختیاں برداشت کیں۔ ان کے کتنے افراد شہید ہوئے۔ کرنل اشفاق نے ان کی تعداد نہیں بتائی جو میرے خیال میں انہیں

بتانی چاہیے تھی لیکن یہ بات واضح ہے کہ این ایل آئی کا سخت جانی نقصان ہوا۔ ان بلند و بالا پہاڑوں پر شجاعت کی جو ناقابل قیاس داستانیں رقم ہوئیں اور جو یک طرفہ نہ تھیں، (دشمن نے ان کا اعتراف کیا) آخر ان کا مقصد کیا تھا وہ کن بلند تر مقاصد کے لئے تھیں؟

اہم ترین بات جو یہ کتاب واضح کرتی ہے وہ کارگل آپریشن اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے فوجی انقلاب کے درمیان تعلق ہے۔ اس حماقت کے مرتکب افراد کو بہت سے سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ان افراد کو جنہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بعید از قیاس قربانیاں دیں، شرمسار کر دیا گیا۔ فوج بدنام ہوئی۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی سبکی ہوئی۔ اس کے بعد تسلسل کے ساتھ پاکستان پر سرحد پار "دہشت گردی" کا الزام لگتا رہا یہاں تک کہ یہ اصطلاح پوری دنیا میں عام ہو گئی۔ کشمیر پر ہمارا موقف، مستحکم ہونے کی بجائے تشویش ناک حد تک کمزور ہو گیا۔

یہ بات کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس بلاضرورت حماقت اور قومی سانحے کے مرتکب افراد کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ شیکسپیر کے ڈرامے میکبتھ کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سارے سمندر مل کر بھی خون کے ان دھبوں کو صاف نہیں کر سکتے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چنانچہ خون کو چھپانا ضروری تھا، اور اس کی یادیں محو کرنا لازم۔

یہ وہ ضرورت تھی جس نے کارگل کے منصوبہ سازوں کے ہاتھوں ۱۲ اکتوبر کے سانحے کو جنم دیا۔ نواز شریف واشنگٹن اس لئے گئے تھے کہ وہ فوجی دستوں کی واپسی کے لئے کوئی راستہ ڈھونڈنے میں صدر کلنٹن کی مدد حاصل کر سکیں تا کہ پاک فوج کو ذلت سے بچایا جا سکے۔ لیکن جب جرم، ہوس کے ساتھ اشتراک کرتا ہے تو اپنے راستے خود تراشتا ہے۔ جنرل مشرف اور ان کے کارگل کے ساتھیوں نے اقتدار پر قبضہ کر کے جرنیلوں کے زیر سایہ، ملک پر ایک طویل رات مسلط کر دی جس کے بد

نتائج آج بھی پاکستان بھگت رہا ہے۔

آخری باب "طویل ترین دن" ایک انفرادی مقام رکھتا ہے کہ اس میں ۱۲ اکتوبر کے واقعات کی تفصیلات بڑی شرح و بسط کے ساتھ پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دوسرے سانحے میں کلیدی کردار کراچی کے کور کمانڈر، لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی نے ادا کیا لیکن خود ان کے لئے اس طویل ترین دن کے نتائج مختلف ہو سکتے تھے۔

پاکستان میں دوسری وجوہات کی بنیاد پر تو گردنیں ماپی جاتی ہیں لیکن ماضی میں کردہ گناہوں کی کوئی سزا نہیں۔ چنانچہ ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ کارگل پر کبھی کوئی تحقیقاتی کمیشن تشکیل نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اور کچھ نہیں تو قوم کا اتنا حق تو ہے کہ اسے یہ پتہ چلے کہ ہوا کیا تھا۔ یہ کتاب بطریق احسن اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

ایاز امیر
کالم نگار اور ممبر قومی اسمبلی



پس منظر

پاکستان اور بھارت کے تعلقات شروع ہی سے کشیدہ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخ کا اپنا ایک کردار ہے۔ مسلمان دنیا کے اس حصے میں تقریباً ایک ہزار برس تک حکمران رہے۔ ان کے آخری برائے نام حکمران بہادر شاہ ظفر، جن کی حکمرانی دہلی کے لال قلعے تک محدود رہ گئی تھی، کو انگریزوں نے گرفتار کر کے جبری طور پر جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا تھا۔ انگریز یہاں تقریباً دو سو برس حکمرانی فرماتے رہے۔ پھر جب یہ سلطنت قیمتی سرمایے کی بجائے وبال جان بن گئی تو انہوں نے اس سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ بھارت کی آزادی کے تین فریق تھے:

۱۔ انگریز اس وقت کے حکمران۔
۲۔ ہندو تیس کروڑ کی بھاری اکثریت۔
۳۔ مسلمان دس کروڑ کی تعداد میں بھارت کی سب سے بڑی اقلیت۔

انگریز کبھی نہ بھول پائے کہ اقتدار انہوں نے مسلمانوں سے چھینا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھا اور انہیں زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان کیا گیا اور پاکستان اور بھارت کو اپنی اپنی ریاستوں میں قدم جمانے کے لیے صرف ۷۲ دن کی

مہلت ملی۔ بھارت تو پہلے دن سے ہی اپنے پاؤں پر کھڑا تھا، جس کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کام کر رہے تھے۔ جبکہ پاکستان کو ہر کام نئے سرے سے شروع کرنا تھا، کوئی دفتری نظام تھا نہ کوئی دفتر۔ اگر بوسیدہ عمارتوں یا درختوں کی چھاؤں میں دفتر قائم کر بھی دیے گئے تھے تو میزیں تھیں نہ کاغذ۔ پیپر پن جیسی معمولی اشیاء بھی میسر نہ تھیں۔ بس ایک جذبہ تھا جو لوگوں کو مستعد رکھے ہوئے تھا۔ کلرک اپنے قلموں میں روشنائی گھر سے ڈال کر لاتے تھے اور پنوں کی جگہ کیکر کے کانٹے استعمال کرتے تھے۔ بے سروسامانی کے عالم میں ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ مصیبت یہ کہ انگریز جاتے جاتے بھی یہ چاہتے تھے کہ ان کا اثر و رسوخ کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے۔ ہندوستان کا آخری وائسرائے دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ جب قائداعظم محمد علی جناح نے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو اسے یہ بتایا کہ پاکستان کو اس کی یہ تجویز منظور نہیں تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کے اور معمار پاکستان کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ انگریز ذہنیت کا آئینہ دار ہے:

ماؤنٹ بیٹن: آپ کو معلوم ہے اس کی آپ کو کیا قیمت چکانی پڑے گی؟

جناح: شاید پاکستان کے سرمایے سے چند کروڑ کی محرومی۔

ماؤنٹ بیٹن: نہیں، تمام سرمایوں اور پاکستان سے محرومی۔(۲)

آزادی کے معاملات میں دوسرے فریق ہندو تھے۔ وہ بھی کبھی نہیں بھولے کہ مسلمان برصغیر ہند پر ایک ہزار برس تک حکمرانی کرتے رہے۔ ''اب ہماری باری ہے'' ان کا خیال تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے ایک الگ قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنے لئے الگ وطن کا مطالبہ کیا تو وہ ششدر رہ گئے۔ ہندوؤں کے رہنما گاندھی جی نے فرمایا، ''مجھے تو تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایسا گروہ جس نے اپنا دین بدل لیا ہو اپنے آباؤ اجداد سے لاتعلق ہو کر ایک الگ قومیت کا دعویٰ کرے۔ اگر بھارتی ظہور اسلام سے پہلے ایک قوم تھے تو ان کی کثیر تعداد کی مذہب کی تبدیلی کے

باوجود اب بھی انہیں ایک ہی قوم رہنا چاہیے''۔(۳)

انہوں نے تقسیم ہند کی بھرپور مخالفت کی اور فرمایا، ''کسی زندہ وجود کو دو حصوں میں کاٹنے کا مطلب تو اس کی جان لینے کے مترادف ہے''۔(۴)

جب ہندوؤں کی تمام تر مخالفت، سازشوں اور الٹی تدبیروں کے باوجود پاکستان وجود میں آ گیا تو انہیں یہ خوش گمانی تھی کہ یہ زیادہ دن نہیں چل سکے گا۔ کانگریس کے ایک اہم لیڈر سردار پٹیل نے متعصب ہندوؤں کی یہ کہہ کر تشفی کی، ''جناح کو اس کی ریاست دے دو۔ اس نے ویسے بھی چلنا تو ہے نہیں۔ پانچ سال کے اندر اندر مسلم لیگ ہمارے دروازے کھٹکھٹا رہی ہو گی اور ہم سے دوبارہ الحاق کی بھیک مانگ رہی ہو گی''۔(۵)

اپنے گورنر جنرل کی شہ پا کر، بھارت نے پاکستان کو اس کے حصے کے ساڑھے پچاس کروڑ روپے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کسمپرسی کی حالت میں تھا۔ تقسیم کے وقت تقریباً ایک کروڑ لوگوں نے ہجرت کی۔ سرحدیں عبور کرتے ہوئے تقریباً ستر لاکھ افراد شہید کر دیے گئے۔ پاکستان کو مہاجروں کی بحالی میں سخت دشواریاں پیش آئیں۔ پاک فوج کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کے حصے میں آنے والے زیادہ تر فوجی جنوب مشرقی ایشیا میں پھنسے ہوئے تھے۔ وسائل قلیل تھے، مسائل بے شمار۔ دوست اور دشمن، سبھی کو پاکستان کا سنبھلنا ناممکن نظر آتا تھا۔ برطانیہ کے وزیراعظم محترم اٹیلی نے تو پہلے ہی فرما دیا تھا، ''پاکستان قابل عمل تجویز نہیں ہے''۔(۶)

انہی صاحب کے ایک اور بیان سے برطانیہ کا رویہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، انہوں نے فرمایا، ''پاکستان کی تجویز پر ہم کبھی متفق نہیں تھے لیکن بدقسمتی سے ہمیں اس سے اتفاق کرنا پڑا''(۷)

انگریزوں نے بادل نخواستہ پاکستان کی تجویز سے اتفاق تو کر لیا لیکن انہوں نے اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ نہ صرف پنجاب اور

بنگال کو تقسیم کیا گیا بلکہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والے علاقے کا کچھ حصہ بھی بھارت کو اس لئے دے دیا گیا کہ انہیں کشمیر تک رسائی حاصل ہو جائے۔ اس کام کے لئے ایک سڑک بنائی گئی جس پر انتہائی تیز رفتاری سے کام مکمل کیا گیا اور اسے خفیہ رکھا گیا۔

تقسیم سے پہلے جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پورے بھارت کا گورنر جنرل تھا بیس جون کو بھاگم بھاگ کشمیر پہنچا اور اس نے مہاراجہ پر زور دیا کہ وہ پندرہ اگست سے پہلے کسی الحاق کا اعلان نہ کرے۔

تقسیم کے وقت بھارت میں تقریباً ۵۶۵ ریاستیں تھیں۔ ان میں سے کچھ تو فرانس جیسی بڑی تھیں اور کچھ اتنی چھوٹی جیسے کسی دیہاتی علاقے کی کسی حویلی کا رقبہ۔ تقسیم ہند کے منصوبے کے مطابق ان ریاستوں نے پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک سے الحاق کرنا تھا اور اس الحاق کے لئے دو باتیں پیش نظر رکھنی تھیں:

۱۔ عوام کی خواہشات۔

۲۔ علاقے کا جغرافیائی اتصال۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک جونا گڑھ، حیدر آباد اور کشمیر کے علاوہ تمام ریاستوں نے مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق پاکستان یا بھارت سے الحاق کا اعلان کر دیا تھا۔

ریاست جونا گڑھ چار ہزار مربع میل کے علاقے پر مشتمل تھی اور اس کی آبادی تقریباً آٹھ لاکھ تھی۔ اس کا حکمران مسلمان تھا، لیکن ۸۰ فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جونا گڑھ حکومت نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ حکومت پاکستان نے اس الحاق کو قبول کرتے ہوئے بھارتی حکومت کو مطلع کر دیا۔ بھارت کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم محمد علی جناح کو لکھا ''یہ الحاق ان اصولوں کی صریح خلاف ورزی ہے جن کی بنیاد پر تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کیا گیا تھا''۔(۸)

بھارتی حکومت نے اس الحاق کی اس بنیاد پر، پر زور نفی کی کہ جونا گڑھ کی ریاست جغرافیائی طور پر بھارت سے متصل تھی اور یہ کہ ریاست کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو بھارت نے اپنے فوجی دستے ریاست جونا گڑھ کے اردگرد متعین کر دیے۔ بہانہ یہ بنایا کہ کاٹھیاواڑ میں امن وامان کی صورت حال مخدوش ہے اور اس سے بھارت کی سیکورٹی کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ اس کے بعد پولیس ایکشن کے ذریعے جونا گڑھ پر قبضہ کر لیا گیا۔ بعد ازاں وہاں بھارتی حکومت نے رائے شماری کروائی۔ بھارتی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس رائے شماری میں اکثریت نے بھارت سے الحاق کے حق میں رائے دی۔

حیدر آباد میں بھی یہی صورت حال تھی۔ وہاں کا حکمران مسلمان تھا اور ۸۵ فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ حیدر آباد کے نظام کی خواہش تھی کہ یا تو حیدر آباد آزاد رہے یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اسے سختی سے منع کیا کہ وہ ان میں سے کسی تجویز کا اعلان نہ کرے۔ اس نے نظام کو بھارت سے الحاق کے فائدے گنوائے۔ جب نظام نے اس کے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا تو پوری بھارتی قیادت مشتعل ہو گئی اور اپنے بیانات میں نظام کے خلاف زہر اگلنے لگی۔ بھارتی حکومت کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے حیدر آباد حکومت نے اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل سے تحفظ کی درخواست کی، لیکن اس سے پہلے کہ سیکورٹی کونسل حیدر آباد کی درخواست پر غور فرماتی، بھارتی فوج نے ریاست پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ بہانہ یہ گھڑا کہ نسلی فسادات کے بھارت تک پھیلنے کا خدشہ تھا۔ جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلق ہے تو انتقال اقتدار کے وقت مسلمان کل آبادی کا ۸۷ فیصد تھے۔ وادی کشمیر میں مسلمانوں کا تناسب ۹۳ فیصد تھا۔ مذہبی نقطہ نظر سے ہٹ کر بھی اور بہت سے عوامل ایسے تھے جن کی بنیاد پر کشمیر کا الحاق صرف پاکستان ہی سے ہو سکتا تھا۔ مثلاً کشمیر کا بیرونی دنیا سے رابطہ بذریعہ سڑک یا ریل صرف پاکستان ہی کے ذریعے ممکن

تھا کہ لوگ باہر جانے کے لیے راولپنڈی یا سیالکوٹ کے راستے ہی استعمال کرتے تھے۔ ڈاک اور برقی نظام بھی پاکستان ہی سے گزرتا تھا۔ تجارت کا واحد راستہ بھی پاکستان ہی تھا۔ روزمرہ استعمال کی اہم اشیائے ضرورت یعنی پیٹرولیم، چینی، نمک اور دیگر اشیاء پاکستان ہی کے ذریعے درآمد کی جاتی تھیں اور وادی جہلم کا راستہ ہی وہ واحد راستہ تھا جس کے ذریعے کشمیر کے پھل دساور کو بھیجے جاتے تھے۔ کشمیر کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ سیاحت تھی اور دنیا کے تمام سیاح کشمیر جانے کے لئے راولپنڈی سے ہو کر گزرتے تھے۔ اسی طرح دریائے جہلم ہی واحد دریا تھا جس میں کشمیر کے جنگلات کی لکڑی برآمد کرنے کے لئے بہائی جاتی تھی۔

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو کشمیر پر چودھویں صدی کے بعد مسلمان ہی حکمران رہے ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت یہاں انیسویں صدی تک قائم رہی۔ جب ۱۸۱۹ء میں پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے اسے فتح کیا تو افغانیوں کو حکمرانی سے برطرف کر دیا۔ پھر اس نے ایک ڈوگرہ راجپوت گلاب سنگھ کو جموں کا راجہ مقرر کیا۔ گلاب سنگھ نے آہستہ آہستہ اپنی سلطنت وسیع کی اور سوائے وادی کشمیر کے تمام علاقے اپنے زیرنگیں لے آیا۔ وادی کشمیر اس نے ۱۸۴۶ء میں انگریزوں سے ساڑھے پچھتر لاکھ روپے میں خریدی۔

تقسیم ہند کے وقت کشمیر کا حکمران زیرنگیں مہاراجہ ہری سنگھ تھا۔ کشمیر اسمبلی کی اکثریت نے، یعنی ۲۱ ارکان میں سے ۱۶ نے ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان سے الحاق کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ الحاق کے اعلان میں تاخیر کر دے۔ دریں اثناء ہندو رہنما جن میں گاندھی اور کرشنا مینن شامل تھے، سرینگر پہنچ گئے تاکہ مہاراجہ کو عوام کی خواہشات کے علی الرغم بھارت سے الحاق پر آمادہ کریں۔ جب یہ ساری کوششیں رائیگاں ہوتی نظر آئیں تو ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارتی

فوج بذریعہ جہاز سرینگر پہنچا دی گئی۔ اس کے فوراً بعد الحاق کی دستاویزات ہز ہائی نس مہاراجہ کو پیش کی گئیں جو ایک رات پہلے سرینگر سے بھاگ کر جموں تشریف لا چکا تھا۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ مہاراجہ صاحب نے الحاق کی دستاویزات پر دستخط ثبت فرما دیے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ دستاویز نہ تو کبھی اقوام متحدہ کو پیش کی گئی نہ بھارتی پارلیمنٹ کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ بھارتی پولیس نے اس کی گمشدگی کی خبریں نمایاں طور پر شائع کیں۔ (۹)

کشمیری عوام کو جب بھارت سے الحاق کی خبر ہوئی تو وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور آزادی کے لئے مسلح جدوجہد شروع کر دی۔ درحقیقت یہ جدوجہد تو بہت پہلے ہی شروع ہو چکی تھی جب مہاراجہ نے پاکستان سے الحاق کے اعلان میں تاخیر کی تھی اور کشمیر کی مسلم اکثریت نے خطرہ محسوس کیا تھا کہ کہیں مہاراجہ ان کی خواہشات کے برعکس بھارت سے الحاق کا اعلان نہ کر دے۔ تحریک آزادی کشمیر کو اتنی پذیرائی ملی کہ بھارت نے خود اقوام متحدہ سے مداخلت کی درخواست کی۔ جنگ بندی کی درخواست کرتے ہوئے بھارت نے وعدہ کیا تھا کہ تنازعہ کشمیر کے حل کے لئے اقوام متحدہ کی زیرنگرانی عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے رائے شماری کروائی جائے گی۔ بھارت نے یہ وعدہ کئی بار دہرایا۔

۲ نومبر کو آل انڈیا ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو نے فرمایا، "ہم نے یہ اعلان کیا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا حتمی فیصلہ وہاں کے عوام ہی نے کرنا ہے۔ یہ وعدہ ہم نے صرف کشمیری عوام سے نہیں کیا بلکہ دنیا سے بھی کیا ہے۔ ہم اس سے روگردانی کر سکتے ہیں نہ کریں گے۔ ہمیں بخوبی احساس ہے کہ بحران کے لمحوں میں کوئی حتمی فیصلہ اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک عوام کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا پورا موقع نہ دیا جائے"۔ (۱۰)

۱۲ فروری ۱۹۵۱ء کو بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم نہرو

نے کہا، "ہم نے کشمیری عوام اور اقوام متحدہ سے رائے شماری کا وعدہ کیا ہے۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں اور قائم رہیں گے کہ کشمیر کے بارے میں فیصلہ وہاں کے عوام ہی کریں"۔ انہوں نے اپنا موقف ۲ جولائی ۱۹۵۱ء کو پھر دہرایا اور کہا، "ہم اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے گئے ہیں اور اس کے پر امن حل کے لئے ہم نے وعدہ کیا ہے۔ ایک عظیم قوم کی حیثیت سے ہم اس وعدے سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ اس کا حتمی فیصلہ ہم نے کشمیری عوام پر چھوڑا ہے اور ہم ان کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔(۱۱)

ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور اب تک کشمیر میں کوئی رائے شماری نہیں ہوئی۔ بھارت نے بڑی آسانی سے اپنا موقف تبدیل کر لیا ہے۔ ۲۳ جون ۱۹۵۷ء کو اقوام متحدہ میں بھارت کے مندوب کرشنا مینن نے خطاب کرتے ہوئے کہا، "ہمارے لئے یہ اہم معاملہ ہے۔ ہم ایک فیڈریشن ہیں کنفیڈریشن نہیں۔ جب کوئی یونٹ فیڈریشن سے الحاق کر لیتا ہے تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں"۔

کشمیری عوام بھارت کی غلامی سے نجات کے لئے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہ بھارت کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ اس نے کشمیری عوام اور دنیا سے کیا وعدہ کیا تھا۔ بھارتیوں نے ۱۹۸۹ء میں اپنا موقف پھر تبدیل کیا اور ان کی قیادت نے یہ موقف اختیار کیا کہ کشمیر میں کئی بار انتخاب ہو چکے ہیں اور عوام کی ان انتخابات میں شرکت اس بات کا عندیہ ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ کشمیریوں نے اس کا جواب ۱۹۸۹ء کے انتخابات کے بائیکاٹ کی صورت میں دیا۔ یہ بائیکاٹ اتنا بھرپور اور موثر تھا کہ سیکورٹی ایجنسیوں کے دباؤ کے باوجود صرف ۲ فیصد رجسٹرڈ ووٹروں نے اس میں شرکت کی۔

بھارت کی کہہ مکرنیوں کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس نے کبھی اپنے وعدے نہیں نبھائے۔ جب ضرورت پڑی وعدہ کر لیا، جب ضرورت نکل گئی تو مکر گئے۔ اس

طرح دونوں ملکوں میں کشیدگی بڑھتی رہی، تلخیاں جنم لیتی رہیں۔

۱۹۷۲ء میں دونوں ملکوں نے شملہ معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ اس میں طے ہوا تھا کہ دونوں ملک اپنے تنازعات باہمی گفت وشنید یا کسی ایسے پر امن طریقے سے حل کریں گے جس پر دونوں ملک متفق ہوں۔ دونوں ملکوں میں جو بھی تنازعہ ہو گا اس کے حتمی حل تک، کوئی فریق یک طرفہ طور پر صورت حال بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا اور دونوں فریق کسی ایسے اقدام کی حمایت یا حوصلہ افزائی نہیں کریں گے جو دونوں ملکوں کے پر امن تعلقات میں بگاڑ کا سبب بنے۔

اس کے بعد بھارت نے ایک اور قلا بازی کھائی۔ اس نے اسلامی ممالک کی تنظیم (OIC)، اقوام متحدہ یا کسی اور طرف سے دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات طے کرانے کی کوششیں تو اس بنیاد پر رد کر دیں کہ دونوں ملک اپنے جھگڑے باہمی گفت وشنید کے ذریعے نمٹانے کے پابند ہیں اور جب پاکستان اسے مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کی دعوت دیتا تو اس کا کہنا ہوتا کہ کشمیر تو بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور اس موضوع پر کوئی بات چیت نہیں ہو سکتی۔

سیاچن میں بھارت کی مداخلت کا آغاز ۱۹۷۸ء سے ہوتا ہے۔ جب ان کے ہائی آلٹی چیوڈ سکول کے کمانڈنٹ سریندر کمار نے سیالہ کا دورہ کیا۔ اسی سال سکردو کے سپرنٹنڈنٹ پولیس، علی احمد نے علی برانگسہ اور گوما میں، جو شمالی علاقوں میں انسانی آبادی کا آخری گاؤں ہے، بھارتی فوج کے کچھ سپاہی دیکھے۔ جب اس نے اپنے ساتھیوں سمیت ان کا پیچھا کیا تو وہ فرار ہو گئے۔ ایس پی علی احمد کو مقام مذکور سے لداخ سکاؤٹس کی وردیاں اور بھارتی سگرٹوں کے ٹکڑے ملے۔

۱۹۸۴ء میں بھارت نے شملہ معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے سیاچن گلیشیر کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس سے پہلے سیاچن گلیشیر ہمیشہ پاکستان کا حصہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں چھپنے والے تمام نقشوں میں،

جن میں برٹانیکا اٹلس، ٹائم اٹلس آف ورلڈ اور ساؤتھ ایشیا کی ہسٹاریکل اٹلس شامل ہیں، سیاچن کو پاکستان کا حصہ دکھایا جاتا رہا ہے۔ دنیا سے سیاحوں اور کوہ پیماؤں کی جتنی جماعتیں آتی تھیں وہ علاقے میں داخل ہونے سے پہلے اور کوہ پیمائی کے لئے حکومت پاکستان ہی سے اجازت حاصل کرتی تھیں۔

اس معاملے پر ۱۹۸۷ء سے ۱۹۸۹ء تک ڈیفنس سیکرٹری کی سطح کے پانچ بار مذاکرات ہوئے لیکن بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے نتیجہ خیز نہ ہو سکے۔ بھارت کے اشتعال انگیز رویے نے پاکستانی قیادت کو مذاکرات سے مایوس کر دیا۔ تب انہوں نے مدد کے لئے مغربی ممالک کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ در اصل ہماری سیاسی اور فوجی قیادت کے شروع ہی سے مغربی ممالک سے رابطے رہے ہیں اور وہ اس فریب میں بھی مبتلا رہے ہیں کہ وہ وقت پڑنے پر ہماری مدد کو آسکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے وعدے کبھی وفا نہیں ہوئے اور ان کے بھروسے پر ہم نے جو مہم جوئی بھی اختیار کی، اس میں ہمیں ناکامی ہوئی اور بھارت نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ہماری قیادت کی نفسیات اس طرح کی ہے کہ تمام تر بے وفائیوں کے باوجود وہ مغرب ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ بھارت نے ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ ہم سراب کے پیچھے بھاگتے رہے اور بھارت نے ہمیں ہماری زمین اور وسائل کے بڑے حصے سے محروم کر دیا۔

اگر بھارت نے یہی رویہ اپنائے رکھا تو علاقے میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔

تنازعہ کارگل بھارت کے غیر قانونی، غیر اخلاقی اور بے اصول موقف کا رد عمل تھا، اور اگر بھارت نے اپنے رویے کی اصلاح نہ کی تو اس طرح کے تنازعات سر اٹھاتے رہیں گے۔ بھارت کو یہ احساس کرنا چاہیے کہ جموں و کشمیر پر اس کا غاصبانہ قبضہ ایک خطرناک کھیل ہے جو دونوں ملکوں کے درمیان ایٹمی جنگ پر بھی منتج ہو سکتا ہے۔ بھارت کو ایک نہ ایک دن مذاکرات کی میز پر آنا ہے اور تنازعہ کشمیر کا ایسا حل

تلاش کرنا ہے جو مسئلے کے تینوں فریقوں یعنی پاکستان، بھارت اور کشمیری عوام کے لئے قابل قبول ہو۔

جہاں تک کارگل کے تنازعے کا تعلق ہے، بھارت سے زیادہ اس نے پاکستان کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہی تنازعہ فوجی انقلاب کا پیش خیمہ بنا اور ایک اچھی بھلی جمہوری طور پر منتخب حکومت جو تمام تنازعات کو پر امن طور پر حل کرنے کے لئے کوشاں تھی، برطرف کر دی گئی۔ چار جرنیلوں کے گروپ نے بے صبر ہو کر ایسی مہم جوئی اختیار کی جس نے پاکستان کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔ دنیا کی نظروں میں ہم بے آبرو ہوئے اور اپنے بہترین سپاہیوں سے بھی محروم ہو گئے۔ یہ کتاب اس مہم جوئی کی المناک داستان ہے اور اس امید پر لکھی گئی ہے کہ موجودہ فوجی قیادت' جو فوج کو اس کے اصل پیشہ وارانہ کردار کی طرف لوٹانے کی مخلصانہ کوشش کر رہی ہے، تنازعہ کارگل کے نقصانات اور اس کے بد اثرات کا جائزہ لے کر ان کے ازالے کے لئے موثر اقدامات کر سکے۔



حوالہ جات

(۱) پیٹرک فرنچ۔ "لبرٹی اور ڈیتھ"۔ فلیمنگو پبلیکیشنز۔ ۱۹۹۸ء، صفحہ ۲۷۹۔

(۲) یوسف صراف۔ "کشمیریز فائٹ فار فریڈم"۔ فیروز سنز راولپنڈی ۱۹۷۷ء، صفحہ ۷۴۳۔

(۳) سٹینلے والپرٹ۔ "جناح آف پاکستان"۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ نواں ایڈیشن۔ ۲۰۰۲ء، صفحہ ۳۳۳۔

(۴) سٹینلے والپرٹ۔ "نہرو"۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ نیویارک۔ ۱۹۹۶ء صفحہ ۴۱۶۔

(۵) لیری کولنز اور ڈی لیپرز۔ "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ"۔ میکملن۔ ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۱۹۔

(۶) سٹینلے والپرٹ۔ "جناح آف پاکستان"۔ ولیم ہائیمن میڈیکل بکس لمیٹڈ۔ ۱۹۶۱ء، صفحہ ۳۰۶۔

(۷) فرانس ولیم۔ "اے پرائم منسٹر ریمیمبرز"۔ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز۔ ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۱۔

(۸) خواجہ سرور حسن۔ "دی کشمیر کویسچن"۔

www.contactpakistan.com/kashmir/articles/hotmail

(۹) بریگیڈیئر (ر) محمد شفیع خان۔ "کشمیر ایکسیشن ٹو انڈیا"۔ اے فراڈ کشمیر سٹڈی سنٹر۔ ۹۴۔ کیولری گراؤنڈ لاہور کینٹ۔ ۱۹۹۹ء، صفحہ ۲۲

(۱۰) نہرو براڈ کاسٹ۔ آل انڈیا ریڈیو۔ ۲ نومبر ۱۹۴۷ء

(۱۱) امرت بازار پتریکا۔ ۲ جولائی ۱۹۵۲ء



ورائے عقل تھیں اہل "ہوس" کی تدبیریں

ذکر ہے سردیوں کی ایک شام کا اور اک ایسے مقام کا کہ بے آب و گیاہ میدان پہاڑوں سے گھرا۔ جنوری کے مہینے میں کوئٹہ اور اس کے مضافات میں شامیں ویسے تو بہت یخ بستہ ہوتی ہیں لیکن اس دن سورج دن بھر چمکتا رہا تھا اور الوداعی کرنوں میں کچھ حدت باقی تھی جو تھکے ماندے ان افسروں کو بھلی لگ رہی تھی جو تمام دن مختلف فوجی مشقوں میں مصروف رہے تھے۔

کوئٹہ میں واقع سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس پاک فوج کے نوجوان افسروں کو انفنٹری میں زیر استعمال ہتھیاروں میں مہارت اور کمپنی سطح تک فوجی دستوں کی قیادت کی تربیت دیتا ہے۔ عام طور پر ان کاموں کیلئے الگ الگ کورس ہوتے ہیں لیکن اس مرتبہ ہتھیاروں میں مہارت اور جونیئر آفیسرز عسکری قیادت کو اکٹھا کر دیا گیا تھا اور کورس کو آفیسرز ویپن اینڈ جونیئر آفیسرز لیڈر شپ کورس (owjol-1) کا نام دیا گیا تھا۔ اس کورس میں شریک افسر، دن بھر کی فوجی مشقوں کے بعد فائر پاور کا ایک مظاہرہ دیکھنے جمع ہوئے تھے۔ تھکن سے نڈھال ان افسروں کو یہ اطمینان تھا کہ اب انہیں خود کچھ نہیں کرنا بس مظاہرہ دیکھنا ہے۔ مظاہرے کے انعقاد کی ساری ذمہ داری ویپن ٹریننگ آفیسر اور اس کے عملے پر تھی۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور افسر زمین پر بچھائی دریوں پر پاؤں پسارے بیٹھے تھے۔ مظاہرے میں کچھ دیر دکھائی دی تو کچھ افسر لیٹ گئے، کچھ نے اپنے پٹھوؤں سے ٹیک لگالی۔ اچانک فضا میں ایک گانے کے بول ابھرے،

سن اوئے بلوری اکھ والیا

اساں دل تیرے نال لا لیا

تیری مہربانی، میرے ہانی، میرا بن جا

کسی نے مائک کے قریب رکھا ٹیپ ریکارڈر پوری آواز میں کھول دیا تھا اور لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اس کی آواز چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ افسروں نے دائیں بائیں دیکھا اور یہ جان کر کہ کوئی اس گانے پر معترض نہیں، موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کچھ منچلے اٹھ کھڑے ہوئے اور رقص کرنے لگے۔ دوسرے افسر تالیاں بجانے لگے اور جلد ہی پورے ماحول پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ افسر رقص کرنے اور تالیاں بجانے میں مگن تھے کہ اچانک ایک قیامت برپا ہو گئی۔ موسیقی تھم گئی اور چاروں طرف مشین گنوں کی تڑ تڑ سنائی دینے لگی۔ چاروں طرف سے شعلے لپک رہے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے شر پسند عناصر نے افسروں پر حملہ کر دیا ہو۔ مختلف ہتھیاروں کی فائرنگ کے بعد ٹریسر فائر ہوئے جنہوں نے افسروں کے اوپر ایک چھتری سی تان دی۔ پھر کچھ ویری لائٹ فائر ہوئیں جو ایک پیراشوٹ کی مدد سے نیچے اترتی ہیں اور اپنے نیچے کے علاقے کو منور کر دیتی ہیں۔ لاؤڈ سپیکر پر ایک آواز ابھری،

”جو قومیں رقص و سرور میں غرق ہو کر عیاشی میں مبتلا ہو جاتی ہیں، روح جہاد سے محروم ہو جاتی ہیں اور اپنی بقا کے لئے مسلح جدو جہد کو فراموش کر دیتی ہیں، بہت جلد قصہ پارینہ بن جاتی ہیں“۔

ویری لائٹ کی مدھم روشنی میں افسروں نے دیکھا کہ سکول کا ویپن ٹریننگ آفیسر مائک پر تھا۔ فائر پاور مظاہرہ شروع ہو چکا تھا۔

بلوچ رجمنٹ کا ایک کپتان طارق مجید (موجودہ جنرل اور چیئرمین جوائنٹ

چیفس آف سٹاف کمیٹی) بڑبڑایا، ”کیا مبہم جو افسر ہے اور پڑھانے کا کیا نرالا انداز اختیار کیا ہے“۔

ویپن ٹریننگ افسر پنجاب رجمنٹ کا ایک میجر، جاوید حسن تھا۔ آنے والے وقت میں اس نے قومی وقار اور سینکڑوں جانوں کی قیمت پر کہیں زیادہ خطرناک مہم جوئی کا مظاہرہ کرنا تھا۔

ان کی شہرت ایک دانشور کی سی تھی۔ وہ جب کمانڈ اینڈ سٹاف کالج میں لیفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے تعینات تھے تو انہیں بھارت کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کو کہا گیا۔ انہوں نے یہ مقالہ لکھنے میں تین برس لگائے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ٹائٹل تھا ”انڈیا، اے سٹڈی ان پروفائل“۔ بلاشبہ یہ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کے اس وقت کے کمانڈنٹ میجر جنرل امین خان برکی نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا، ”بھارت کی کچھ مجبوریاں ہیں اور انتہائی اہم۔ ۱۹۷۱ء کے بعد بھارت کو خطے کی ایک غالب قوت کی حیثیت دینے کا رجحان تھا۔ قومی اور بین الاقوامی میڈیا نے یہ تصور اجاگر کرنے میں شاطرانہ کردار ادا کیا، لیکن ہمیں فوجی تجزیہ نگار کی حیثیت سے انتہائی فہم و فراست اور ٹھنڈے مزاج سے معروضی حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے بھارت کی علاقائی قوت کا ادراک کرنا چاہیے۔ معروضی حقیقتوں کا تجزیہ ہمیں بھارت کے بارے میں متوازن موقف کی طرف رہنمائی کرے گا جس میں اس کی کمزوریاں بھی پیش نظر ہوں اور مستند قوتیں بھی۔ کسی ایک کے یک طرفہ جائزے سے غلط نتائج اخذ کیے جائیں گے۔ اگر بھارت کی محض طاقت وری اور استعدادی قوت کار کو شمار کیا جائے تو ہم ان اشتہاری مبہم جو افراد سے متاثر ہوں گے جو بھارت کو منی سپر پاور کی حیثیت دینے پر مصر ہیں اور اگر بھارت کی مجبوریوں اور کمزوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو بھارت اپنے سائز کے مطابق ہی نظر آئے گا یعنی ایک ایسی فوجی قوت جس کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ صحیح نقطہ نظر بڑا ضروری ہے“۔

لیفٹیننٹ کرنل جاوید حسن نے بھارت کے بارے میں اہم اعداد و شمار اکٹھے کیے اور لکھا، ''بھارت علاقے کے اعتبار سے دنیا کا ساتواں بڑا اور آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا ملک ہے۔ پورے کرہ ارض کا چالیسواں حصہ اس کے زیرِ نگیں ہے اور دنیا کی کل آبادی کا چھٹا حصہ بھارت میں رہتا ہے۔ یہ ایک ملک نہیں برصغیر ہے۔ اپنی آبادی اور علاقے کے سائز کے پیش نظر بھارت خود کو بڑی طاقتوں میں شمار کروانے کا متمنی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی فوجی قوت میں اس قدر اضافہ کر لیا ہے کہ اب اس کی فوج، دنیا کی تیسری بڑی فوج، چوتھی بڑی فضائیہ اور چھٹی بحری قوت ہے''۔

کرنل جاوید نے ہندو معاشرے کی خامیاں اور نقائص گنواتے ہوئے لکھا، ''جن لوگوں نے بھارت کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے وہ اس کی جمہوریت کو ''وظیفہ بد امنی'' گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھارت میں سوشلزم رائج ہے نہ سیکولرازم۔ یہ ایک شدت پسند مذہبی ملک ہے..... ملک کے کچھ حصوں میں کسی بیمار بچے کی بجائے کسی گائے کو طبی امداد زیادہ آسانی سے مل سکتی ہے..... ایک ماڈرن برہمن ڈاکٹر بھی کسی شودر کی نبض چیک کرتے ہوئے اس کی کلائی پر کوئی کپڑا لپیٹ دیتا ہے تاکہ اسے چھونے سے وہ پلید نہ ہو جائے''۔

بھارت کی جغرافیائی صورت حال بیان کرتے ہوئے کرنل جاوید لکھتے ہیں، ''برصغیر کی قدرتی سرحدیں، پہاڑ اور سمندر ہیں۔ اس کے جنوب میں سمندر ہے۔ جبکہ سندھ ڈیلٹا کے مغرب سے اراکان کے ساحلوں تک کچھ علاقوں کو چھوڑ کر نیم دائرے میں پہاڑوں کی ایک فصیل نے اسے تین اطراف سے گھیرا ہوا ہے۔ یہ قدرتی فصیل مغرب اور شمال مغرب کی طرف زیادہ موثر نہیں ہے جہاں خیبر، کرم، بولان، اور مختلف حجم کے قریباً ساڑھے تین سو درے واقع ہیں جن کی گزرگاہیں پنجاب کے وسیع میدانوں کی طرف کھلتی ہیں۔ برصغیر کا یہ بفر کئی بار ٹوٹا جب ان دروں کے ذریعے آریائی، یونانی، ہنز اور مسلم فاتح برصغیر میں داخل ہوئے۔ ان اطراف سے آنے

والے آخری فاتحین مسلمان تھے''۔

دہلی کے جغرافیائی محل وقوع کو برصغیر میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اسی سے گنگا جمنا کی پوتر سرزمین ''ہندو استھان'' (ہندوستان) کا راستہ کھلتا ہے۔ شمال مغرب سے بھارت پر حملہ آور ہونے والوں کے مقدر کا فیصلہ یہیں ہوا۔ کچھ حملہ آور تو یہاں تک پہنچ ہی نہ پائے اور کچھ یہاں سے گزر نہ سکے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں داریوس اور ۳۲۷ قبل مسیح میں سکندر اعظم کی فتوحات پنجاب کے میدانوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ لیکن جو دہلی کی مشکل گزرگاہ سے نکل کر ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے انھوں نے برصغیر کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔

اور اس کتاب کے اہم ترین اقتباسات، ''ہندوؤں کے عہد میں جو سیاسی اور فوجی نظام تشکیل پایا، وہ بھارت پر حملہ آوروں کو کبھی شکست نہ دے سکا، اگرچہ ان حملہ آوروں کے مقابلے میں کہیں بڑی فوجیں اتاری گئیں جو ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس تھیں۔ مورخ اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ سکندر اعظم کے مدمقابل کے پاس دو لاکھ پیدل فوج، تین ہزار ہاتھی، بیس ہزار شہ سوار اور دو ہزار رتھیں تھیں، پھر بھی وہ سکندر اعظم کو شکست نہ دے سکا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک پیچیدہ سوال ہے کہ ان چھوٹی فوجوں نے جو اپنے مستقر سے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آئی تھیں کس طرح اپنے سے کہیں بڑی فوجوں کو انتہائی عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ ونسنٹ سمتھ کی رائے ہے کہ ہندوستانی فوج کی کمان کو قبائلی، نسلی اور چھوت چھات کی تقسیم نے پریشان کیے رکھا۔

دہلی پر مسلمانوں کی حکمرانی ۱۲۰۶ء میں قائم ہوئی اور ۱۵۲۵ء تک جاری رہی۔ اس سلطنت کو پہلا خدشہ مغرب کی طرف سے چنگیز خان کی قیادت میں آنے والے منگولوں سے ہوا جو فوجی قوت کی بجائے سفارتی سرگرمیوں کے ذریعے ٹال دیا گیا۔ دوسرا خطرہ تیمور کی قیادت میں مسلمان ترک منگولوں سے ہوا...... دہلی کی مسلم سلطنت کو صحیح معنوں میں پہلا چیلنج بابر کی طرف سے ملا۔ ہندوستان کی ایک لاکھ فوج

جو مسلمانوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی، بابر کے بارہ ہزار سپاہیوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ بابر کے بیٹے ہمایوں کی نالائقی سے شیر شاہ فتح یاب ہوا۔ لیکن پانی پت کی دوسری جنگ میں ہمایوں نے ایرانی بادشاہ کی مدد سے شیر شاہ کے جانشینوں سے اپنی سلطنت دوبارہ حاصل کر لی۔ پھر یہی ہوا، عددی برتری کے باوجود ہندوستانی فوج مغرب کی طرف سے آنے والی ایک چھوٹی فوج کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔

مغرب کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کے ہاتھوں ہندوستانی فوج کی شکست در شکست کا سلسلہ جاری رہا۔ ۷۱۲ء سے ۱۲۰۶ء تک عربوں، افغانوں، اور ترکوں کی مسلمان فوجوں نے کئی بار ہندوستان کی نسبتاً بڑی فوج کو شکست دی۔ اگرچہ ان کا اسلحہ بھی بہتر تھا اور وہ بھاری سازوسامان سے بھی مزین تھیں"۔

ان تمام دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ بھارت مغرب سے آنے والے پر عزم حملہ آوروں کے خلاف کبھی اپنا دفاع نہیں کر سکا اگرچہ اس کی فوجوں کو عددی برتری بھی حاصل تھی اور بہتر سازوسامان بھی میسر تھا۔ اور میجر جنرل جاوید حسن بھارت کے شمال مغرب میں فورس کمانڈ ناردرن ایریا کے کمانڈر تھے۔ انھوں نے خود کو پر عزم کمانڈر سمجھا اور سوچا کہ وہ تاریخ کو دہرا سکتے ہیں اور اپنے مقدر کو جو پہلے ہی بڑا روشن تھا، مزید چمکا سکتے ہیں۔

موصوف گفتگو کے فن میں ماہر ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ضرورت پڑے تو وہ براعظم انٹارکٹیکا کے باشندوں کو برف کے ٹکڑے موتی بتا کر بیچ سکتے ہیں۔ ان میں کوئی کسر تھی بھی تو واشنگٹن میں ملٹری اتاشی کی حیثیت سے تعیناتی نے پوری کر دی۔ وہ وہاں سے واپس آئے تو زیادہ پر اعتماد، زور آور اور امریکی تہذیب سے متاثر تھے۔ کچے ذہن شہر کی چکا چوند روشنیوں سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں تنبیہ کی گئی ہے کہ "لا یغرنك تقلب الذین كفروا فی البلاد" کافروں کے شہروں میں چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں مبتلا نہ کر دے۔ (سورہ ال عمران۔ آیت ۱۹۶)

نابالغ ذہن کے افراد کسی بہانے چند دن مغربی یا یورپی ملکوں کے کسی شہر میں

ہو آئیں، زندگی بھر بس وہیں کے گن گاتے ہیں۔ بریگیڈیئر جاوید نے تو پھر پورے چار برس واشنگٹن میں گزارے تھے۔ امریکہ ہر سال مختلف ملکوں سے دانشوروں، صحافیوں، ادیبوں اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے دیگر افراد کو اپنے خرچ پر بلاتا ہے کہ وہ امریکہ سے متاثر ہو کر واپس جائیں تو امریکی مفادات کے فروغ کے لئے کام کریں۔ جو ان کے اشاروں پر کام کرنے کو تیار ہوں تو امریکہ ان کی باقاعدہ سرپرستی فرماتا ہے۔ بریگیڈیئر جاوید ان کے لئے ایک تر لقمہ تھے جو اپنے ملک کے خرچ پر ان کے ہاں براجمان تھے۔ وہ انہیں محبوب تھے اور اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوئی کہ واپسی پر انہیں میجر جنرل بنا کر ایف سی این اے کی کمان دے دی گئی۔ بھارت میں سیاچن کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل اروند شرما کو کمان سے برطرف کر دیا گیا تھا اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل ایم ایل نامدہ کو کمانڈر بنایا گیا تھا۔ میجر جنرل جاوید حسن کو کارگل کے سانحے کے بعد لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر ایک کور کی کمان دے دی گئی۔ بھارتی جنرل کو بعد ازاں جودھپور میں کورٹ آف انکوائری کا سامنا کرنا پڑا، جنرل جاوید کو مسلح افواج کے شاندار ادارے نیشنل ڈیفنس کالج کا کمانڈنٹ مقرر کر دیا گیا، مقام استغفار ہے۔

شمالی علاقوں میں ایم آئی۔ ۱۷ ہیلی کاپٹر کے سکواڈرن کی شمولیت نے جنرل جاوید کے منصوبے کو مہمیز عطا کی، جس کا تفصیلی ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ جنرل جاوید نے جب لائن آف کنٹرول عبور کرنے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے انہیں اپنے سے بالا دو کمانڈروں کو اعتماد میں لینا تھا۔ دسویں کور کے کمانڈر اور چیف آف جنرل سٹاف مان جاتے تو چیف آف آرمی سٹاف کو راضی کرنا مشکل نہیں تھا۔ دسویں کور کے کمانڈر پہلے ہی ان سے متاثر تھے اور ان کی باتوں کو بڑے شوق سے سنتے تھے۔ وہ اور چیف آف آرمی سٹاف ایک ہی یونٹ سے تھے۔ یہ تعلق چیف کو راضی کرنے میں بڑا کام آیا۔

چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان خود بھی شمالی علاقوں کی سربراہی کر چکے تھے۔ انہوں نے ۸۰ بریگیڈ کو بھی کمانڈ کیا تھا۔ دسویں کور میں وہ چیف آف سٹاف رہے تھے اور ایف سی این اے کے کمانڈر بھی۔ گویا شمالی علاقوں کے امور سے وہ گہرے منسلک رہے تھے۔ جو اپنے عہدے میں خود ہی کر سکے۔ ان کا ایک دستہ وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ وہ جنرل جاوید کے منصوبے سے متفق تھے۔ تب جنرل مشرف کو اس منصوبے کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دی گئی۔ جنرل مشرف بین الاقوامی ردعمل خاص طور پر امریکیوں کے بارے میں متفکر تھے۔ جنرل جاوید امریکہ میں ڈیفنس اتاشی ہونے کے ناطے اور امریکیوں کے بارے میں حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں بڑے وثوق سے پوری بلاغت سے اظہار خیال کر سکتے تھے۔ امریکہ میں اپنے قیام کے دوران وہ کھانے کی کتنی ہی دعوتوں میں شریک رہے تھے۔ ان کی امریکی جنرلوں اور دیگر حکام سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہوں نے چیف آف آرمی سٹاف کو بتایا: "امریکی درحقیقت بھارتیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر ہم کچھ کر سکیں تو یقیناً وہ ہمارا ساتھ دیں گے"۔

جنرل مشرف نے کہا: "آپ تو ایسے بیان کر رہے ہو جیسے یہ سب کچھ بہت آسان ہو۔ بہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں۔ لیکن محتاط رہنا۔ میں نہیں چاہوں گا کہ ہمارے فوجی بھارتیوں کے ہاتھ لگیں"۔

جنرل جاوید نے جنرل مشرف کو اس بات پر بھی قائل کر لیا کہ وہ اس منصوبے کی ہوا دوسروں کو نہ لگنے دیں۔ انہوں نے کہا: "راز نیچے کی سطح سے نہیں اوپر کی سطح سے افشا ہوتے ہیں"۔

جنرل مشرف مان گئے اور جب تک فوجی دستے لائن آف کنٹرول عبور کر کے مختلف پوسٹوں پر قابض نہیں ہو گئے انہوں نے کور کمانڈروں یا فضائیہ اور بحریہ کی قیادت تک کو اعتماد میں نہیں لیا۔ جب کور کمانڈروں تک کو اعتماد میں نہیں لایا گیا تو یہ چاروں سول گورنمنٹ کو کیسے یہ حق حاصل تھا کہ انہیں بتایا جاتا کہ چار جرنیلوں کا یہ

گروپ کیا کرنے چلا ہے۔

این ایل آئی بٹالینز کے پاس وہ افراد تھے جو دوران پرواز کمانڈروں کی گفتگو سن لیتے تھے۔ جنرل جاوید نے کئی پائلٹوں کو کئی بار کہہ رکھا تھا: "اگر تمہیں پتہ نہیں تو پتہ لگانے کی کوشش بھی نہ کرنا اور اگر تمہیں کچھ پتہ ہے تو اسے اپنے سینوں میں دفن رکھو"۔

منصوبے کو شروع کرنے سے پہلے ایک اہم ترین ضرورت پوری کرنا درکار تھی۔ سردی سے بچاؤ کے ملبوسات اور گولہ بارود اگلے علاقوں میں ذخیرہ کیا جانا تھا۔ اس کام کے لیے سول ٹھیکیداروں کی خدمات حاصل کی جاتیں تو راز افشا ہونے کا خدشہ تھا کہ معمول کی ذخیرہ اندوزی کی نسبت بڑی بھاری خدمات کی ضرورت تھی۔ فیصلہ کیا گیا کہ تمام تر اشیاء ایم آئی ۱۷ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے آگے پہنچائی جائیں گی۔ یہ ہیلی کاپٹر پہلے سے استعمال ہونے والے ہیلی کاپٹروں کے مقابلے میں کافی بڑے تھے۔ سب سے مشکل کام توپوں کو آگے پہنچانے کا تھا۔ اس کا بھی حل ایم آئی ۱۷ سے نکال لیا گیا۔ توپوں کو کھول دیا گیا اور ان کے مختلف حصے الگ الگ ہیلی کاپٹر کے رسوں سے ہیلی کاپٹر سے لٹکا کر آگے کے علاقوں میں پہنچائے گئے۔ ۱۳۰ ملی میٹر کی توپیں بہت بھاری تھیں۔ ایک توپ کی ایک بیرل ہی ۲۰۰۰ کلوگرام وزن رکھتی تھی۔ ایک ٹائر کا وزن ساڑھے چار سو کلو تھا۔ ایک توپ ایک ہیلی کاپٹر کے آٹھ پھیروں میں آگے پہنچتی تھی۔ اس طرح ہیلی کاپٹر سکواڈرن کے پرواز کے وہ گھنٹے جو عام حالات میں دو سال کے لئے کافی ہوتے، تین ماہ میں استعمال کر لیے گئے۔ یہ تمام استعمال سے جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی اس کے پیش نظر تمام پرزے پہلے ہی منگوا کر ذخیرہ کر لیے گئے تھے۔

کارگل کے علاقے میں توپخانے نے اہم کردار ادا کیا۔ اس لئے اس کا ذکر ہم قدرے تفصیل سے کریں گے۔

۱۹۹۸ء میں ایف سی این اے کا چارج سنبھالتے ہوئے آفریدی سے صرف ایک

لیفٹیننٹ کرنل توپخانے کے امور کے بارے میں کمانڈر کا مشیر مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں جب آرٹلری کا عارضی ہیڈکوارٹر کھڑا کیا گیا تو ایک لیفٹیننٹ کرنل، کمانڈر آرٹلری مقرر ہوئے جس کے ماتحت دو سٹاف افسر تھے۔ اس وقت فورس کمانڈ ناردرن ایریا میں کل دو مارٹر بیٹریاں اور تین این ایل آئی ماؤنٹین بیٹریاں تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ توپخانے کا سازوسامان بتدریج بڑھتا رہا اور سانحہ کارگل کے وقت ایف سی این اے میں آرٹلری کا پورا کمانڈ سٹرکچر موجود تھا جس کی قیادت ایک بریگیڈیئر کے ہاتھ میں تھی اور چھوٹی بڑی ملا کر کل ۱۵۶ توپیں تھیں۔ بھارتی توپخانے میں ۲۱۵ توپیں تھیں اور اس طرح انہیں ۱:۱٫۰۳ کی برتری حاصل تھی۔ جنگی اصولوں کے مطابق حملہ آور دستوں کو تین ایک کی عددی برتری حاصل ہونی چاہیے، لیکن جیسا کہ ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں، ایف سی این اے کمانڈر کے ذہن پر بھارتی تاریخ سے اخذ کردہ نتائج اس بری طرح چھائے ہوئے تھے کہ انہوں نے ہمسایہ فارمیشنوں یا جی ایچ کیو سے زائد توپیں مانگنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ جب جنگ چھڑی اور فوجی دستوں کا اگلے علاقوں میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تو آرٹلری کی کمک طلب کی گئی اور مزید توپیں منگوائی گئیں۔ اس طرح پاکستانی توپوں کی تعداد ۲۱۳ ہو گئی لیکن بھارت نے بھی اپنی توپوں میں اضافہ کیا اور ان کی تعداد ۴۶۲ ہو گئی۔ اس طرح انہیں ۱:۲٫۱۶ کی عددی برتری حاصل تھی۔ پاکستانی توپوں کا قریباً سارا گولہ بارود اور زیادہ تر توپیں ہیلی کاپٹروں کی مدد سے آگے پہنچائی گئیں۔ ۶۱ گن پوزیشن قائم کی گئیں، جن کی تفصیلات سیکورٹی کی خاطر حذف کی جا رہی ہیں۔ ان توپوں کا فائر کنٹرول کرنے کے لئے ۴۴ مشاہداتی چوکیاں قائم کی گئیں۔ انتظام و انصرام کافی نہیں تھا۔ اگر کوئی توپ خراب ہو جاتی تو اس کی خرابی دور کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ خراب توپ خاموش رہ کر اپنی بہنوں کو آگ اگلتا دیکھتی رہتی۔ ۵۰۲ ورکشاپ سے کچھ مکینک منگوائے گئے تھے لیکن ضروری اوزار و آلات کے بغیر وہ بھی بے بس تھے۔

ذیل میں اپنے اور بھارتی توپخانے کا موازنہ پیش کیا گیا ہے:

توپ کی قسم	پاکستانی	بھارتی	نسبت
فیلڈ گن	۵۳	۹۳	۱:۱٫۷۵
مارٹر	۵۱	۶۳	۱:۱٫۲
میڈیم گن	۴۵	☆۵۴	۱:۱٫۲
فور بیرل راکٹ لانچر	۷	-	۷:۰
ٹوٹل	۱۵۶	۲۱۰	۱:۱٫۳

☆ ان میں بھارت کی بہترین بوفور توپیں بھی شامل ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ دونوں فریقین نے بعد میں مزید توپوں کی ضرورت محسوس کی اور مزید توپیں منگوائی گئیں۔ بعد کی صورت حال کا موازنہ درج ذیل ہے:

توپ کی قسم	پاکستانی	بھارتی	نسبت
فیلڈ گن	۶۱	۱۸۶	۱:۳٫۰۴
مارٹر	۵۹	☆۷۸	۱:۱٫۳۲
میڈیم گن	۷۷	☆☆۱۹۲	۱:۲٫۴۹
فور بیرل راکٹ لانچر	۷	-	۷:۰
سنگل بیرل راکٹ لانچر	۹	-	۹:۰
ملٹی بیرل راکٹ لانچر	-	۶	۰:۶
ٹوٹل	۲۱۳	۴۶۲	۱:۲٫۱۶

☆ ان میں ۱۸ بھاری مارٹر شامل تھیں۔

☆☆ ان میں ۱۲۶ بوفور توپیں شامل تھیں۔

طبی امداد کی فراہمی جسے منصوبہ شروع کرنے سے پہلے سوچا جانا چاہیے تھا، موخر کر دی گئی تھی۔ جب اگلے مورچوں سے زخمیوں کی واپسی ہوئی تو آرمی میڈیکل کور کے ایک افسر لیفٹیننٹ کرنل سید فصیح الدین بخاری کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ آبادی سے ہٹ کر مین ڈریسنگ سٹیشن قائم کریں۔ ایم ڈی ایس اصل میں ایک میڈیکل بٹالین کا حصہ ہوتا ہے جو لڑاکا یونٹوں کے زخمیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ایک میڈیکل بٹالین میں تین ADS (ایڈوانس ڈریسنگ سٹیشن) اور ایک ایم ڈی ایس ہوتا ہے۔ ADS اگلے مورچوں کے قریب قائم کئے جاتے ہیں اور چھوٹی موٹی سرجری اور مرہم پٹی کا کام کر سکتے ہیں جب کہ شدید زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد کے بعد ایم ڈی ایس بھیج دیا جاتا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل سید فصیح الدین بخاری نے سکردو سے کافی دور ایم ڈی ایس قائم کیا جس میں ۵۰ بستروں کا ایک ہسپتال اور ایک اپریشن تھیٹر شامل تھا۔ ان کے عملے میں انتھک مخلص ڈاکٹر اور نرسیں شامل تھیں جنہوں نے اگلے مورچوں سے آنے والے زخمیوں کے علاج کے لئے دن رات کام کیا اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔



تھکے ماندے فوجی۔ لائن آف کنٹرول کے پار

پاکستان کے شمالی علاقوں میں ڈومیل ایک سرسبز وادی ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور دامن میں گھنے درختوں سے اٹے جنگلات۔ وادی میں ہر طرف سیاہ گلاب کی جھاڑیاں ہیں جن کی چتکبری شاخیں بھی خوبصورت لگتی ہیں۔ افسران کے کانٹے چھیل کر شیروں سے ان کے سرے پر چیتل کی پتریاں چڑھوا کر سٹک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وادی کے ایک طرف یخ بستہ پانی کی ایک جھیل ہے جس کے نیلگوں پانی میں قوس قزح کے رنگوں والی ٹراؤٹ مچھلیاں تیرتی ہیں۔ جھیل کا پانی ارد گرد کے علاقوں کو سیراب کرتا ہے اور برف سے مستور پہاڑوں سے آنے والی تین ندیاں جھیل کے پانی کو ختم نہیں ہونے دیتیں۔ درجہ حرارت کم ہوتا ہے، بہت ہی کم۔ سردیوں کے موسم میں یہ نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر جاتا ہے اور پوری وادی کو ڈیپ فریزر میں بدل دیتا ہے۔ تمام تر حسن و جمال، سحر آگیں اور نظر فریب نظاروں کے باوجود یہاں رہنا مشکل ہے، بہت مشکل۔

پالیسی کے مطابق یونٹ کٹھن مقامات پر صرف دو سال کے لئے رکھے جاتے ہیں پھر انہیں کم بلندی والے مقامات جیسے گلگت، بونجی، رٹو یا سکردو جیسی جگہوں پر تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اب وجوہات کا علم تو بالا کمانڈروں ہی کو ہو گا۔ ۱۲ ناردرن

لائٹ انفنٹری بٹالین سات سال تک ڈومیل میں ٹھہری رہی اور برفانی طوفانوں، جھکڑوں اور برفشاروں کے دکھ سہتی رہی۔ ۱۹۹۸ء کے آخر میں یونٹ کو لیفٹیننٹ کرنل سید امجد شبیر کمان کر رہے تھے جن کا تعلق ۳۰ بلوچ رجمنٹ سے تھا۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۹۸ء میں یونٹ کی کمان سنبھالی۔

۱۲۔ این ایل آئی ڈومیل ہی میں تھی جب کیپٹن کرنل شیر یونٹ میں آئے۔ رہائشی سہولتیں کم تھیں اس لئے انہیں الگ کمرہ نہیں ملا بلکہ ایک اور یونٹ ۲۴ سندھ کے رجمنل میڈیکل آفیسر، کیپٹن آصف کے ساتھ ٹھہرایا گیا۔ یہ یونٹ ۱۲۔ این ایل آئی کے دائیں جانب تعینات تھی۔ رہائش کے معاملے میں ہر شخص تخلیہ پسند ہوتا ہے اور کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ کیپٹن آصف کو بھی اپنے کمرے میں کسی اور کا آنا اچھا نہیں لگا اور پھر وہ بھی کسی اور یونٹ کے افسر کا۔ مجبوری تھی، حکم حاکم۔ لیکن ان کی ناگواری بڑی عارضی ثابت ہوئی۔ کیپٹن شیر، خوش اطوار بھی تھا، حاضر دماغ بھی۔ گھنی داڑھی والا یہ مولوی جو مذہبی فرائض بڑی باقاعدگی سے ادا کرتا تھا، خوش باش شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی صحبت میں کوئی شخص بیزار نہیں ہوتا تھا۔ کیپٹن شیر، آصف کے ساتھ صرف پندرہ دن رہے اور جب انہیں اپنا الگ کمرہ مل گیا تو کیپٹن آصف ان کے جانے پر بہت اداس تھے۔ شیر نے ان کے ذہن پر ناقابل فراموش اثرات چھوڑے تھے۔

یونٹ میں شمولیت اختیار کرنے کے فوراً بعد کیپٹن شیر نے اپنی کمپنی کے جوانوں کو مختلف کھیلوں میں مصروف کر دیا۔ وہ انگیٹھیوں اور چولہوں سے لگ کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا بلکہ موسم کی سختیوں سے مقابلے کے لئے جسمانی مشقتوں، کھیلوں، بھاگ دوڑ اور کوہ پیمائی جیسی صحت مند سرگرمیوں میں مصروف رہنے کا قائل تھا۔ وہ ایک بہترین نشانہ باز اور اول درجے کا نشانچی تھا۔ این ایل آئی کے سالانہ مقابلے ہونے والے تھے۔ اس نے کمانڈنگ آفیسر سے اجازت طلب کی کہ ان مقابلوں کے لئے اسے ٹیم کے چناؤ اور انہیں تربیت دینے کا اختیار دیا جائے۔ وہ خود ڈیلٹا کمپنی میں تھا لیکن

اجازت ملنے پر اس نے پورے یونٹ سے بہترین افراد کا انتخاب کیا اور پھر ان کی تربیت میں جت گیا۔ اس کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ این ایل آئی سنٹر بونجی میں ہونے والے چار طرح کے مقابلوں میں ۱۲۔ این ایل آئی نے تین میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ظاہر ہے ٹرافی تو ان کے حصہ میں آنی ہی تھی۔

ڈومیل میں سات برس کے قیام کے بعد جب یونٹ کے افراد بجا طور پر یہ توقع کر رہے تھے کہ اب انہیں کسی بہتر مقام پر بھیجا جائے گا، انہیں مزید بلند علاقے بلغری میں پہنچنے کا حکم ملا جو لائن آف کنٹرول کے بالکل قریب ہے۔

اور یہ دسمبر ۱۹۹۸ء کے وسط کی بات ہے جب بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے حکم ملا کہ لائن آف کنٹرول کے پار جا کر ریکی کریں۔ کس مقصد کے لئے؟ ایک قدرتی سوال تھا۔ جواب میں انہیں ڈانٹ پلائی گئی۔ بزدلی کے طعنے سننے کو ملے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۸ء کو صبح منہ اندھیرے، کیپٹن ندیم اور کیپٹن علی، حوالدار لالک جان اور مزید تین افراد نے لائن آف کنٹرول عبور کی۔ وہ چھوٹے ہتھیار، خشک راشن اور ایک چھوٹے خیمے کے کچھ حصے اٹھائے ہوئے تھے۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی اور گھمبیر سناٹا۔ لیکن یہ بات تو بالا حکام کو پہلے ہی سے معلوم ہے آخر ہمیں کس لئے بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے خود سے سوال کیا اور چلتے رہے کہ شاید کوئی غیر معمولی بات دیکھنے میں آئے۔ کوئی درخت تھا، نہ جھاڑی۔ اس بلندی پر کچھ اگتا بھی تھا تو برف کی دبیز تہوں تلے مستور تھا۔ دشمن کا کوئی سپاہی بھی نظر نہیں آیا کہ وہ بھی معمول کے مطابق موسم سرد ہونے پر کم بلندی والے مقامات کی طرف اتر گئے تھے۔ کیپٹن ندیم اور علی سارا دن گھومتے رہتے اور جب رات کا اندھیرا چھانے لگتا تو کسی جگہ پر خیمہ لگاتے، چولہا جلاتے اور کھانا پکاتے، چائے بناتے اور کھا پی کر سو رہتے۔ تین دن، تین راتیں انہوں نے لائن آف کنٹرول کے پار گزاریں۔ چوتھے دن ۲۱ دسمبر کی شام کو وہ یونٹ میں واپس آئے۔

انہوں نے اطلاع دی کہ سارا علاقہ خالی پڑا ہے۔ گھاس پھونس ہے نہ شجر

اشجار۔ برف ہی برف۔ دشمن کا بھی دور دور پتہ نہیں۔ کسی قسم کا سایہ یا پناہ میسر نہیں۔ رہنا بہت ہی مشکل ہے۔ ویسے بھی اس علاقے میں دسمبر سے اپریل تک موسم میں اتنی شدت آجاتی ہے اور برفشار اتنے تسلسل سے گرتے ہیں کہ چار یا پانچ افراد کو بھی ضرورتاً کہیں بھیجنا ہو تو فارمیشن ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینی پڑتی ہے۔

کیپٹن ندیم اور علی کو واپس آئے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ نئے احکامات وصول ہوئے کہ دو سو آدمیوں کے لئے اسلحہ، گولیاں، خشک راشن، تیار خوراک کے بند ڈبے، مٹی کا تیل، چولہے اور خیمے بٹاکولین میں ذخیرہ کیے جائیں۔ یہ جگہ لائن آف کنٹرول پر واقع تھی اور اسے نقشوں پر پوائنٹ ۱۲۱ کا نام دیا گیا۔ علاقے میں سڑکیں تو تھیں نہیں۔ سامان اٹھا کر برف میں چلنا بہت مشکل تھا، چنانچہ زوہ کا استعمال کیا گیا۔ یہ بیل نما جانور شمالی علاقوں ہی میں پایا جاتا ہے اور قدرت نے اسے ایسی ذہانت سے نوازا ہے جو ان بلند علاقوں میں رہنے اور چلنے پھرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ وہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے اور کسی ایسی جگہ پر قدم نہیں رکھتا جس کے نیچے گڑھا یا کھائی ہو۔ اس لئے اسے "پر یقین قدموں" والا جانور بھی کہا جاتا ہے۔ سردیوں کی شدت بڑی آسانی سے جھیلتا ہے بلکہ رات کو کھلے آسمان تلے رہنا پسند کرتا ہے۔

اگلے علاقوں میں ذخیرہ اندوزی کا عمل یکم جنوری ۱۹۹۹ء کو شروع ہوا۔ جب بٹاکولین میں ضروری اشیاء کا ذخیرہ ہو گیا تو انہیں ایم آئی ۱۷ ہیلی کاپٹروں کی مدد سے مزید آگے یلدرم بیس (پوائنٹ ۱۲۲) اور زکریا بیس پہنچایا گیا جسے میجر زکریا یوسف نے قائم کیا تھا۔ یہ بیس یا مستقر، لائن آف کنٹرول سے ساڑھے تین کلو میٹر آگے تھا۔ پیدل جانے والوں کے لئے لائن آف کنٹرول سے چھ سات کلو میٹر آگے ایک اور چوکی قائم کی گئی جسے مڈل پوائنٹ (MP) کا نام دیا گیا۔ موسم کے تیور بار بار بگڑتے تھے۔ گھن گرج کے ساتھ بجلیاں کڑکتی تھیں، بارشوں اور برفباریوں کے طوفان آتے تھے۔ مواصلات کا سلسلہ قائم رکھنے کو جو تاریں بچھائی گئی تھیں، بار بار ٹوٹتی تھیں۔ لیکن پاک فوج کے بہادر جوان اپنے کام میں جتے رہے اور پندرہ فروری ۱۹۹۹ء تک

ضروری اشیاء کی بتائی گئی مقدار اگلے علاقوں میں ذخیرہ کر لی گئی۔



۶-این ایل آئی

فوجی دستوں کو آگے بھیجنے کے وقت ۶-این ایل آئی بنیال میں مقیم تھی۔ اس کی ذمہ داری کا علاقہ پلاور سے نیو جھیل ٹاپ تک پھیلا ہوا تھا۔ ہیڈ کوارٹر اور ایک کمپنی بنیال میں تھی، ایک کمپنی مار پولا میں تھی اور ایک کمپنی ۱۳-این ایل آئی کے زیر کمان ٹمہ میں تھی۔ یونٹ ستمبر ۱۹۹۶ء سے بنیال اور گلتری جیسے بلند علاقوں میں تھی اور موسم کی سختیاں جھیل رہی تھی۔ ۸۵ فیصد افراد اس سال کی چھٹیوں سے بھی محروم رہے تھے۔

خستہ حال اور تھکی ماندی یونٹ کے افراد جب بجا طور پر یہ توقع کر رہے تھے کہ اب انہیں کسی بہتر جگہ بھیجا جائے گا، احکامات وصول ہوئے کہ لائن آف کنٹرول عبور کر کے وہاں چوکیاں قائم کریں۔ اس وقت یونٹ کی کمان ایک دلیر افسر لیفٹیننٹ کرنل منصور کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو بتایا کہ موسم کی شدت اور بھاری برفباری کی وجہ سے لائن آف کنٹرول کے پار چوکیاں قابل دفاع نہیں ہوں گی۔ دوسرے یونٹوں کے افسروں کی طرح انہیں بھی ڈانٹ دیا گیا اور احکامات کی بجا آوری پر زور دیا گیا۔ نقشوں کے حوالے سے مختلف مقامات کی نشان دہی کی گئی اور جلد از جلد چوکیاں قائم کرنے کی ہدایت۔ صرف ان مقامات پر چوکیاں قائم کی جاتیں تو وہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتی تھیں لیکن بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو وضاحت کرنا بیکار تھا۔ کمانڈنگ آفیسر نے خود ہی پوری صورت حال کا جائزہ لیا اور لائن آف کنٹرول کے پار چوکیاں قائم کرنے کا بندوبست کرنے لگے۔

بنیال تک جیپ کا راستہ موجود تھا۔ اس کے بعد ڈھلوانیں اتنی عمودی اور راستے اتنے کٹھن تھے کہ خچر بھی ان پر نہیں چل سکتے تھے۔ راشن اور اسلحہ سپاہیوں ہی نے اٹھا

کر لے جاتا تھا۔ ۴ نومبر کو اپنے ہی علاقے میں ایک اور چوکی قائم کی گئی جسے عظمت چوکی کا نام دیا گیا۔ اس کا کوڈ نمبر پوائنٹ ۳۳۳ تھا۔ (۶-این ایل آئی کا نقشہ ملاحظہ کریں) سب سے اہم کام ایک انتظامی مرکز قائم کرنا تھا، چنانچہ نومبر ۱۹۹۸ء میں لائن آف کنٹرول سے ذرا ادھر یہ مرکز قائم کیا گیا اور اسے سیف اللہ بیس کہا گیا۔ جب منصوبے نے وسعت اختیار کی تو راشن اور اسلحہ ذخیرہ کرنے کے لئے ایک غار کا انتخاب کیا گیا جو لائن آف کنٹرول سے بس پانچ سو گز ادھر واقع تھی۔ اسے پوائنٹ ۷۰۰ کا نام دیا گیا۔ بنیال سے اس کا فاصلہ ۱۵ کلو میٹر تھا۔ زیادہ تر ساز و سامان سپاہی یا پورٹر اٹھا کر لے جاتے۔ کبھی کبھار موسم صاف ہونے پر ہیلی کاپٹر کی کوئی پرواز مل جاتی تو کافی سارا سامان سلنگ لوڈ کے طور پر پوائنٹ ۷۰۰ بھیج دیا جاتا۔

دو تین مقامات کے علاوہ جن کی نشاندہی کی گئی تھی، چوکیاں قائم کرنے کے احکامات مبہم تھے۔ کمانڈنگ آفیسر نے اپنے دستوں کا تحفظ اور سامان رسد کی ترسیل یقینی بنانے کے لئے لائن آف کنٹرول کے پار قریبی علاقوں میں چوکیاں بنانے پر زور دیا۔ ۱۵ دسمبر کو رومیل چوکی قائم کی گئی جسے پوائنٹ ۴۴۴ کا نام دیا گیا۔ ۳۱ دسمبر کو شریف چوکی قائم کی گئی۔

۲ جنوری ۱۹۹۹ء کو کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد بنیال میں یونٹ کے ہیڈ کوارٹر میں آئے۔ انہیں ان چوکیوں اور انتظامی مرکزوں کے بارے میں تفصیلات بتائی گئیں جو لائن آف کنٹرول کے آر پار قائم کیے گئے تھے۔ وہ ان چوکیوں کے قیام سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے علاقے میں موجود بلند ترین چوٹی پوائنٹ ۵۱۴۰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہاں چوکی قائم کرنے کی ہدایت کی۔ (پوائنٹ جغرافیائی اصطلاح میں سطح سمندر سے بلندی ظاہر کرنے کے مختلف طریقوں میں ایک طریقہ ہے۔ اس خاص چوٹی کی بلندی ۵۱۴۰ میٹر یا تقریباً ۱۵۴۴۰ فٹ تھی)۔ ایک مخلص سپاہی کی طرح کیپٹن افتخار نے یہ عزم کیا کہ وہ پوائنٹ ۵۱۴۰ پر چوکی قائم کر کے رہے گا۔ وہ رومیل چوکی پر واپس آئے۔ وہیں ان کی ملاقات میجر تاشفین سے ہوئی۔ دونوں

نے نقشوں کا بغور مطالعہ کیا اور اس چوٹی کو سر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۱ جنوری کو دونوں افسروں نے چند جوانوں کو ساتھ لیا اور پوائنٹ ۵۱۴۰ کے ارد گرد کے علاقے کی ریکی میں مصروف ہو گئے۔ اس چوٹی کی ڈھلوانیں سخت عمودی تھیں اور چوٹی تک رسائی کا کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا تھا۔ ریکی کے دوران ایک مناسب جگہ نظر آئی تو وہاں تاشفین چوکی قائم کر دی گئی۔

۲۶ جنوری کو انہیں پوائنٹ ۵۱۴۰ تک پہنچنے کا ایک راستہ ملا۔ وہ اس راستے کی مدد سے اوپر پہنچے۔ چوٹی اگرچہ مزید بلند تھی لیکن وہ جہاں تک پہنچ سکے تھے وہاں سے بھی چاروں طرف دور کے علاقے صاف دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے اسے کشمیر اوپی یعنی ابزرویشن پوسٹ کا نام دیا اور چوٹی تک پہنچنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ بالآخر وہ ۳۱ جنوری کو پوائنٹ ۵۱۴۰ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسے افتخار مشاہداتی چوکی کا نام دیا گیا۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے علاقے کا یہ بلند ترین مقام تھا۔ یہاں سے شمال کی طرف بمباٹ اور جنوب کی طرف بمباٹ نالہ، دراس اور مراد باغ تک کا علاقہ صاف نظر آتا تھا۔ کیپٹن افتخار نے کمانڈنگ آفیسر منصور کو اطلاع دی۔ کرنل منصور افتخار چوکی پہنچے۔ رات وہیں کاٹی اور واپسی پر ہر چوکی پر ایک ایک دن گزارا۔ جب وہ اقبال چوکی پر تھے اور ارد گرد کے علاقے کا جائزہ لے رہے تھے تو انہوں نے محسوس کیا کہ طارق چوکی باقی چوکیوں سے الگ تھلگ بھی ہے اور دور بھی۔ دشمن کی طرف سے کارروائی کی صورت میں یہ چوکی کہیں کٹ کر نہ رہ جائے۔

وقت نے ثابت کیا کہ ان کی رائے بالکل درست تھی۔ یہ چوکی بعد میں ٹائیگر ہلز کے نام سے مشہور ہوئی اور قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں اس کا بڑا چرچا رہا۔ کرنل منصور نے کیپٹن افتخار کو حکم دیا کہ وہ چوکی کے دائیں جانب کے علاقے کا جائزہ لیں اور کسی مناسب جگہ پر ایک اور چوکی قائم کریں۔ جہاں سے ان کا باہم ملاپ بھی رہے اور بوقت ضرورت وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ کیپٹن افتخار نے چند جوانوں کو ساتھ لیا اور علاقے کے دورے پر نکل گئے۔ طارق چوکی کے شمال میں انہیں

ایک پہاڑی مناسب معلوم ہوئی، چنانچہ ۸ فروری کو وہاں (اپنے ہمراہیوں میں سے ایک کے نام پر) غلام جان چوکی قائم کر دی گئی۔

اب تک قائم کی گئی چوکیوں کی اطلاع بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو دی گئی تو وہاں سے ایک اور مساحتی حوالہ (گرڈ ریفرنس) ملا۔ ٥٤٥٦١١۔ حکم یہ تھا کہ یہاں بھی ایک چوکی قائم کی جائے۔ ہیڈ کوارٹر کے آرام دہ دفتروں میں بیٹھ کر نقشوں کا مطالعہ کرنا بڑا آسان ہے، لیکن زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے چوکیاں قائم کرنا دشوار اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ کیپٹن افتخار نے بھرپور جائزے کے بعد اپنے کمانڈنگ آفیسر کو بتایا کہ اس چوٹی تک رسائی ممکن نہیں۔ کمانڈنگ آفیسر نے افتخار کی رائے سے اتفاق کیا اور ہدایت کی کہ اب تک قائم کی گئی چوکیوں کا دفاع مضبوط کرنے پر توجہ دی جائے۔

کیپٹن افتخار نے پوری صورت حال کا جائزہ لیا۔ اب تک قائم کی گئی تمام چوکیاں مشرقی جانب یعنی ٦ - این ایل آئی کے بائیں جانب تھیں۔ کمانڈنگ آفیسر سے مشورے کے بعد وہ ١٣ فروری کو عاصم گیپ کی طرف گئے۔ یہ علاقہ ١٦٧٣٢ فٹ بلند تھا اور سارے کا سارا گلیشیر کی برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ انہوں نے چوکی تک پہنچنے کے لئے ڈھلوانوں کو تراش خراش کر ایک راستہ بنایا اور ١٨ فروری کو عاصم چوکی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دو دنوں کے بعد وسیم چوکی قائم کی گئی جو ١٦٧٧٧ فٹ بلند تھی۔ کیپٹن افتخار گذشتہ پانچ ماہ سے انہی برفانی علاقوں میں مصروف تھے۔ دونوں عیدیں یعنی عید الفطر اور عیدالاضحیٰ انہوں نے لائن آف کنٹرول کے پار ہی گزاری تھیں، کمانڈنگ آفیسر نے انہیں آرام کے لئے پیچھے بلا لیا۔ ٤ مارچ کو کیپٹن افتخار ستانے کے لئے بٹالین ہیڈ کوارٹر بنیال پہنچ گئے۔ دوسرے افسر اپنے کام میں مصروف رہے۔ میجر اعظم نے ٢٠ اپریل کو پوائنٹ ٤٥٩٠ پر اعظم چوکی قائم کی۔ یہ بعد میں تولولنگ کے نام سے خاصی مشہور ہوئی۔ اس سے دو چار دن پہلے جمال چوکی قائم کی گئی تھی۔ طارق چوکی پوائنٹ ٤٦٨٣ پر قائم کی گئی تھی۔ اس علاقے میں مجاہدین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ طارق چوکی کے دفاع کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی۔ اس

٦ این ایل آئی کی قائم کردہ چوکیاں

کے ارد گرد سات راستے نکلتے تھے اور چٹانوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ توپخانے یا ہوائی حملوں کی صورت میں دراڑوں میں پناہ لی جاسکتی تھی۔



۵-این ایل آئی

۵-این ایل آئی کو جب لائن آف کنٹرول عبور کر کے مختلف چوکیاں قائم کرنے کا حکم ملا تو اس وقت یونٹ کی کمان لیفٹیننٹ کرنل تنویر احمد خان کے ہاتھ میں تھی جو ملٹری ٹریننگ ڈائرکٹوریٹ جی ایچ کیو سے تعینات ہوئے تھے۔ انہوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۸ء کو یونٹ کی کمان سنبھالی تھی۔ ان کے نائب کماندار میجر محمد اسلم ۲ فروری ۱۹۹۸ء سے یونٹ میں تھے جب یونٹ سکردو میں تھا۔ یکم ستمبر کو یونٹ حمزی گنڈ پہنچی تھی اور اس نے انڈس سیکٹر کا دفاع سنبھالا تھا۔ ایڈ جوٹنٹ کی ذمہ داریاں کیپٹن راشد منظور نبھار ہے تھے جو ۲۶ جون ۱۹۹۸ء سے یونٹ میں موجود تھے۔ ۵-این ایل آئی کی ذمہ داری کا علاقہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ ان کی یونٹ کے اپنے افراد کے لئے اتنے وسیع علاقے کا موثر دفاع ممکن نہیں تھا، چنانچہ انہیں زائد افرادی قوت مہیا کی گئی۔ ۴-این ایل آئی اور ۸-این ایل آئی کی ایک ایک کمپنی کے علاوہ چترال اور باجوڑ سکاؤٹس کے کچھ دستے بھی ان کی زیر کمان دیے گئے تھے۔ البتہ شہری بار بردار مہیا نہیں کیے گئے تھے اور اسلحہ، بارود اور خوراک کی ذخیرہ اندوزی کی ذمہ داری بھی سپاہیوں اور سکاؤٹوں کے ذمے تھی۔

ابتدائی طور پر ۵ این ایل آئی کو پوائنٹ ۵۱۴۷، ۵۲۳۷، ۵۰۶۵ اور ۵۱۲۷ پر چوکیاں قائم کرنے کا حکم ملا تھا۔ اب یہ کمانڈنگ آفیسر کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ چوکیاں باہمی ملاپ بھی قائم رکھ سکیں اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد بھی کر سکیں انہیں ایک انتظامی مرکز بھی قائم کرنا تھا جہاں سے ضروری اسلحہ اور خوراک وغیرہ مختلف چوکیوں کو مہیا کی جا سکے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جو لائن آف کنٹرول سے ایک کلومیٹر آگے تھی۔ اسے بدر مستقر کا



۵-این ایل آئی کی قائم کردہ چوکیاں

نام دیا گیا۔ یہاں سے آگے ۵-این ایل آئی کے افراد مختلف سمتوں میں پھیل گئے اور لائن آف کنٹرول کے آگے انہوں نے ۲۶ چوکیاں قائم کیں۔ یہ چوکیاں لائن آف کنٹرول سے ۲۱ سے ۲۴ کلومیٹر آگے تھیں۔ متوقع حملوں اور دشمن کی امکانی کارروائی کے پیش نظر ان چوکیوں پر ۶ سے ۲۵ افراد متعین کیے گئے تھے۔ انتظامی مراکز پر افرادی قوت زیادہ تھی۔ انتظامی مرکز امتیاز اور ریاض لائن آف کنٹرول کے ادھر واقع تھے اور جب ذخیرہ اندوزی مکمل ہوئی تو امتیاز میں ۱۳۳ افراد اور ریاض بیس میں ۴۳ افراد تھے۔ کمانڈنگ آفیسر کو بخوبی احساس تھا کہ ذمہ داری کے وسیع علاقے میں ہر جگہ افرادی قوت متعین نہیں کی جا سکتی تھی۔ البتہ یہ ضروری تھا کہ بلند چوٹیوں پر ایسی مشاہداتی چوکیاں قائم کی جائیں جہاں سے دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے اور امکانی راستوں کو فائر کی زد میں رکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے ان چوکیوں کے علاوہ بھی کئی چوکیاں قائم کرنی پڑیں جن کا حکم بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ملا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ایک یونٹ تقریباً ۹۷ مربع کلومیٹر کے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ چلنا دشوار، موسم ناگوار، وسائل محدود۔ ان عوامل کی موجودگی میں ایک یونٹ کے لئے اتنے وسیع علاقے کو سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ اگلی چوکیوں میں خوراک کی جو مقدار ذخیرہ کی گئی تھی وہ بمشکل دو تین دن چلنی تھی۔ آنے والے دنوں میں مختلف چوکیوں نے تنہا رہ جانا تھا اور چھ چھ سات سات دنوں کے فاقوں کے ساتھ اپنی جنگ آپ ہی لڑنی تھی۔ شاید یہ بات نا قابل یقین معلوم ہو لیکن تلخ حقیقت یہی ہے۔ بعد میں اس کا تفصیلی ذکر آئے گا۔



۱۳-این ایل آئی

۱۳-این ایل آئی نے شمالی علاقوں کے سب سے زیادہ کٹھن اور دشوار مقام شغمہ میں سردیوں کے پانچ موسم گزارے۔ دریائے شنگو اور شیگر کے سنگم سے کرکٹ نالے تک ان کے محاذ کی چوڑائی ۱۸ کلومیٹر تھی۔ ۹ اپریل ۱۹۹۹ء کو انہیں حکم ملا کہ وہ

کافر پہاڑی کی چوٹی پر ایک چوکی قائم کریں۔ کئی کوششوں کے باوجود یہ چوٹی تو سر نہ کی جا سکی البتہ اس کے ارد گرد تین چوکیاں قائم کی گئیں جنہیں Y-2، Y-3 اور Y-4 کا نام دیا گیا۔ ۱۴ اپریل کو انہیں حکم ملا کہ وہ اور آگے جائیں۔ چنانچہ مہینے کے آخر تک انہوں نے آٹھ مزید چوکیاں قائم کیں۔



۳۱ آزاد کشمیر رجمنٹ

یہ یونٹ لیفٹیننٹ کرنل طاہر کی زیر کمان، وانکو میں واقع تھی اور دشمن سے ان کی آنکھ مچولی جاری رہتی تھی۔ پوری یونٹ ایک بہت بڑے تودے کے پیچھے متعین تھی۔ یہ تودہ دشمن کے براہ راست مشاہدے میں تھا اور وہ اکثر اس پر فائرنگ کرتے رہتے تھے لیکن جب تک یونٹ کے افراد اس تودے کے پیچھے رہتے، محفوظ رہتے تھے۔ ان کی چہل پہل شروع ہی سورج چھپنے کے بعد ہوتی تھی جب چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ چاندنی راتیں بھی ان کی نقل و حرکت محدود کرتی تھیں۔ گاڑیوں کے قافلے آگے جانے کے لئے اسی یونٹ کے علاقے سے ہو کر گزرتے تھے۔ انہیں بہت پیچھے روک لیا جاتا تھا اور غروب آفتاب کے بعد اس حال میں آگے جانے کی اجازت ملتی تھی کہ روشنیاں بجھی ہوتی تھیں۔ بائیں جانب پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانیں ہوتیں اور دائیں جانب جھاگ اڑاتا شوں شوں کرتا بہتا دریا۔ اختیار ڈرائیوروں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر وہ دریا میں گرنے سے بچنا چاہتے تو بائیں جانب چلنے کی کوشش کرتے جس میں یہ خدشہ تھا کہ ابھری ہوئی، آگے نکلی ہوئی کسی چٹان سے ٹکرا جائیں۔ زیادہ تر ڈرائیور دائیں جانب رہنا پسند کرتے تھے حالانکہ اس جانب دریا میں گرنے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے امکانات زیادہ تھے۔ اس راستے پر سفر کرتے ہوئے جب مجھے ڈرائیوروں کی یہ منطق سمجھ نہ آئی تو اپنے ڈرائیور سے پوچھ ہی لیا کہ بائیں جانب کیوں نہیں رہتے جہاں حادثے کا خطرہ تو ہے لیکن جان جانے کا خطرہ نہیں۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا، "سر، ایک تو اس طرف شہادت ہے، دوسرے بائیں جانب

حادثے کی تو خیر ہے، کورٹ آف انکوائریاں کون بھگتے"۔

عام معمول یہ تھا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد ایک آدمی اپنی پشت پر سفید کپڑا باندھ لیتا تھا جو گھپ اندھیرے میں چمکتا دکھائی دیتا تھا اور ڈرائیور اس کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ ہم جس ڈرائیور کے ساتھ سفر کر رہے تھے، وہ کئی بار ان راہوں سے آیا گیا تھا اس لئے اس نے یہ احتیاطی تدبیر بھی قبول نہیں کی کہ بندے کے پیچھے پیچھے چلنے سے رفتار بہت کم رہتی تھی۔ ہم پر جو گزر رہی تھی، اس کی اسے خبر تھی نہ پروا۔ سلام ہے ان ڈرائیوروں پر جو ان کٹھن راہوں پر اپنے فرائض بے خوفی سے مسکراتے ہوئے نبھاتے تھے۔



۲۴ سندھ

۲۴ سندھ ستمبر ۱۹۸۸ء میں سیالکوٹ میں کھڑی کی گئی تھی۔ نومبر ۱۹۹۷ء میں یہ رحیم یار خان میں تھی جہاں سے انہیں گلگت پہنچنے کا حکم ملا۔ جنوری ۱۹۹۹ء میں انہیں ڈومیل سیکٹر سنبھالنے کے لئے کہا گیا۔ اس وقت یونٹ کو لیفٹیننٹ کرنل طاہر اکبر کمان کر رہے تھے۔ ان کے محاذ کی چوڑائی ۲۶ کلو میٹر تھی اور پورے سیکٹر کو انہوں نے تین ذیلی سیکٹروں میں تقسیم کر رکھا تھا: نیرو، گجران اور رحمت۔

نیرو سب سیکٹر میں ۱۱ چوکیاں تھیں، گجران میں ۷ اور رحمت میں ۱۱۔

میجر مشتاق نے دو ہفتوں کی مختصر مدت میں آٹھ چوکیاں قائم کی تھیں۔ ان چوکیوں پر رہنا اور ان کا دفاع کرنا بہت مشکل کام تھا کیونکہ ہر چوکی پندرہ ہزار فٹ یا اس سے بھی بلند مقام پر واقع تھی جہاں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے۔ ۱۲-این ایل آئی ان کے بائیں اور ۱۰-این ایل آئی ان کے دائیں جانب تعینات تھی۔



ایٹمی دھماکے اور سفارتی سرگرمیاں

اس بات سے قطعی بے خبر کہ پاکستان کے چار جرنیلوں کے گروپ نے کیا آفت برپا کر رکھی ہے، شہری حکومت بھارت سے کشمیر سمیت تمام تنازعات حل کرنے کے لئے سفارتی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ ۱۱ مئی ۱۹۹۸ء کو پاکستان کی سرحد سے ملحق صحرائی ریاست راجستھان کے علاقے پوکھران میں تین ایٹمی دھماکوں کے بعد بھارتی قیادت کا لب ولہجہ ہی بدل گیا تھا۔ ۱۱ مئی ہی کو بھارت نے اڑیسہ کی ریاست چندی پور فائر رینج پر کم فاصلے والے میزائل "ترشول" کا تجربہ کیا تھا اور دو دنوں بعد ۱۳ مئی کو پوکھران میں دو اور زیر زمین ایٹمی دھماکے کئے تھے۔

اس موقع پر امریکہ کے صدر بل کلنٹن جرمنی کے دورے پر تھے۔ ۱۴ مئی کو جرمنی کے چانسلر ہیلمٹ کول سے ملاقات کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ امریکی قانون انسداد ایٹمی پھیلاؤ ایکٹ ۱۹۹۴ء کے مطابق بھارت کے خلاف پابندیاں لگائی جائیں گی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ بھارت نے ایٹمی دھماکے کر کے علاقے میں خطرناک عدم توازن پیدا کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بھی بھارت کے ایٹمی دھماکوں کی سخت مذمت کی اور بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کم کرنے کے لئے مذاکرات پر زور دیتے ہوئے مزید ایٹمی پھیلاؤ کو روکنے کی تلقین کی۔ امریکی صدر

بل کلنٹن کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پاکستان بھی ایٹمی دھماکے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ برلن ہی سے انہوں نے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف سے بات کی اور انہیں دھماکوں سے باز رہنے کی تلقین کی۔ بل کلنٹن نے نواز شریف کو یقین دلایا کہ بھارت کے خلاف پابندیوں پر پوری طرح عمل درآمد کیا جائے گا۔ نواز شریف نے جواباً کہا تھا، "پاکستان کو اپنی سیکورٹی کی ضرورتوں کو ترجیح دینی ہے اور اس کے پاس اپنے عوام کی امنگوں کے مطابق اپنی سلامتی اور خود مختاری کے لئے مناسب اقدامات کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہیں"۔

جب پاکستان کو دنیا کی طرف سے محض منہ زبانی یقین دہانیاں کرائی جا رہی تھیں، بھارتی قیادت کے لہجے میں غرور در آیا تھا اور انہوں نے سخت زبان میں بات کرنی شروع کر دی تھی۔ جس دن بھارت نے پوکھران میں مزید ایٹمی دھماکے کیے، اسی دن (۱۳ مئی) بھارت کی حکمران پارٹی (بی جے پی) کے صدر نے پارٹی ارکان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، "اگر پاکستان بھارت میں دہشت گردی سے باز نہیں آتا تو اسے منہ کے بل گرانا ہوگا"۔

۱۸ مئی کو بھارت کے وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے ارشاد فرمایا، "اسلام آباد کو علاقے اور دنیا میں جغرافیائی تزویرات میں تبدیلیوں کا احساس کرتے ہوئے بھارت کے خلاف پالیسیوں اور خاص طور پر کشمیر کے بارے میں موقف بدلنا ہوگا"۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا، "بھارت کے ایٹمی قوت بننے کے فیصلہ کن اقدام نے پاک بھارت تعلقات کو ایک نئے مرحلے میں لا کھڑا کیا ہے۔ اب کشمیر کا پائیدار حل تلاش کرنا ہوگا"۔ ۱۹ مئی کو بھارت کے وزیر دفاع جون فرنینڈس نے کہا، "ہم ایک ایٹمی قوت ہیں اور بین الاقوامی برادری کو ہم سے اسی سطح پر بات کرنی چاہیے"۔

پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی مایہ ناز قیادت میں بہت عرصے سے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو

نے انہیں اس کام کے لئے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی اور ان کی ہدایت پر اس وقت کے فنانس سیکرٹری اور بعد ازاں صدر پاکستان غلام اسحاق خان نے انہیں تمام سہولتیں فراہم کی تھیں۔ سائنس دانوں نے قوم کو مایوس نہیں کیا۔ پاکستان نے بہت پہلے ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی تھی اور اس کا انکشاف خود ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے جی ایچ کیو آڈیٹوریم میں فوجی افسروں سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا۔ اپنی دھیمی دھیمی گفتگو میں جس میں بھوپال کا لہجہ شامل تھا، انہوں نے پوری کہانی سنائی تھی کہ وہ کس طرح ہالینڈ سے آئے، بھٹو سے ملے اور جہاں اب کے آر ایل روڈ ہے وہاں آگ برساتی دھوپ میں تپتی ہوئی ٹین کی چھتوں والی بیرکوں میں انہوں نے کام کا آغاز کیا۔ اس تحریر کے مصنف نے ان سے سوال کیا تھا کہ اگر پاکستان نے ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی ہے تو اب تک ایٹمی دھماکہ کیوں نہیں کیا گیا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا کہ آج کل ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دھماکہ کرنا ضروری نہیں، یہ فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے کہ وہ کب دھماکہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس فیصلے کا وقت آ گیا تھا اور ایک سپر پاور کی دھمکیوں اور ٹیلیفون پر ایٹمی دھماکوں سے باز رہنے کی تنبیہہ کے باوجود نواز شریف نے یہ دلیرانہ فیصلہ کر ہی لیا۔ ۲۸ مئی وہ تاریخی دن تھا جب صوبہ بلوچستان کے علاقے چاغی میں پانچ ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان اسلامی دنیا کا پہلا اور دنیا کا ساتواں ایٹمی ملک بن گیا۔ ان دھماکوں کی اوسط قوت ۴۰ سے ۴۵ کلوٹن تھی۔

عین اسی دن وزیر اعظم نواز شریف نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بھارت کو جموں و کشمیر سمیت تمام تنازعات پر مذاکرات کی پیشکش کی۔ ۳۰ مئی کو پاکستان نے چاغی میں ایک اور دھماکہ کر کے چھ دھماکوں کی سیریز مکمل کر لی۔ اسی دن پاکستان کے وزیر خارجہ گوہر ایوب نے سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا، "وہ تزویراتی اور فوجی توازن جو بدقسمتی سے غیر متوازن ہو گیا تھا، اب پاکستان کے حق میں ہے"۔ یکم جون کو اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے وزیر اعظم نواز شریف نے

کہا کہ چھ ایٹمی دھماکے کر کے پاکستان نے دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان کوئی ناکام ریاست نہیں ہے بلکہ معجزاتی کارکردگی کی صلاحیت رکھنے والا ملک ہے۔ ایٹمی دھماکے اور سفارتی سرگرمیوں کے مطلوبہ نتائج جلد سامنے آگئے۔ بھارتی قیادت جس نے ترش لب و لہجہ اختیار کر رکھا تھا اور پاکستان سے خواہاں تھی کہ وہ علاقے کی نئی تزویراتی صورت حال کا احساس کرے، خود نئی صورت حال کو سمجھتے ہوئے اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اب ان کے لب و لہجے میں نرمی آگئی۔ ۴ جون کو بھارتی وزیر اعظم واجپائی نے پارلیمنٹ کے ایوان بالا، راجیہ سبھا سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "بھارت پاکستان سے مذاکرات کے لئے تیار ہے۔ ہم نے چند اقدامات کی تجویز دی ہے اور اگر پاکستان کو کشمیر پر مذاکرات کرنے پر اصرار ہے تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں" پاک بھارت تعلقات کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ بھارت کشمیر پر بات چیت کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔

۸ جون کو بھارتی وزیر اعظم، واجپائی نے بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "ہمیں ماضی میں نہیں ڈوب رہنا۔ میں پاکستان سے جلد از جلد مذاکرات شروع کرنے کی خواہش کا اعادہ کرتا ہوں"۔

پاکستانی وزیر اعظم بجا طور پر ایک نئے اعتماد سے سرشار تھے۔ ۲۲ جون کو اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا "پاکستان کو دھمکیوں سے مرعوب نہیں کیا جا سکتا" انہوں نے بھارت پر زور دیا کہ وہ کشمیر کا بنیادی تنازعہ حل کرنے کے لئے سنجیدہ اور عملی کوشش کا مظاہرہ کرے۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان ایک ایسی قوت بن کر ابھرا تھا جو بھارت کی برتری کو چیلنج کر سکتا تھا اور علاقے کی چھوٹی ریاستوں کو امن اور وقار سے رہنے میں مدد دے سکتا تھا۔ ۲۹ جولائی کو سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں سارک ممالک کی سربراہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف نے کہا، "آیئے مل کر جنوبی ایشیا کو امن ترقی اور خوشحالی کا ایسا گہوارہ بنا دیں جس پر دنیا رشک بھی کرے اور

دوسرے ممالک ہماری تقلید بھی۔ آئیں جنوبی ایشیا میں کشیدگی کی بنیادی وجوہات کے
انداد کے لئے کام کریں اور انصاف مساوات، برابری اور ایک دوسرے کے احترام
کی بنیاد پر خوشگوار تعلقات کی بنیاد ڈالیں"۔

اپنے پرانے طرز عمل سے مختلف لہجہ اختیار کرتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم نے اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "بھارت اپنے تمام ہمسایوں سے اچھے تعلقات قائم کرنے اور ایٹمی پھیلاؤ کو روکنے کے لئے کوششیں جاری رکھے گا"۔

تاریخ میں پہلی بار غیر جانبدار تحریک (نام) جسے قائم کرنے میں بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو سے مل کر کلیدی کردار ادا کیا تھا، نے ۱۲ ستمبر ۱۹۹۸ء کو جموں و کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پر امن مذاکرات پر زور دیا۔ نیلسن منڈیلا جنہوں نے غیر جانبدار تحریک کے بارہویں سربراہی اجلاس کی صدارت کی اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ جموں و کشمیر کا مسئلہ پر امن مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے اور ہر کسی کو اس تنازعے کے حل کے لئے بخوشی آمادہ ہونا چاہیے۔ بھارتی وزیر اعظم اس بات پر سخت جھنجھلائے اور انہوں نے کہا، "دوسرے ممالک کو تنازعہ کشمیر سے باہر رہنا چاہیے"۔

۲۳ ستمبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۵۳ ویں اجلاس کے دوران پاکستانی اور بھارتی وزرائے اعظم کی نیویارک میں ملاقات ہوئی۔ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جموں و کشمیر سمیت تمام تنازعات کو حل کرنا علاقے میں پر امن فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس موقع پر ایک مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا کہ دونوں ملکوں کے سیکرٹری خارجہ ۲۳ جون ۱۹۹۷ء میں طے شدہ ایجنڈے کے مطابق تمام امور پر بات چیت کے طریق کار پر متفق ہو گئے ہیں۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۹ء کو پاکستان اور بھارت ۲۰ فروری سے نیو دہلی اور لاہور کے درمیان بس سروس شروع کرنے پر متفق ہو گئے۔

گذشتہ پچاس سال میں پہلی مرتبہ پاکستان اور بھارت کے پارلیمنٹ کے

ارکان ۱۳ اور ۱۴ فروری کو اسلام آباد میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے علاقے میں کشیدگی کم کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات پر زور دیا۔ ۱۷ فروری کو پاکستان اور بھارت نے نیو دہلی اور لاہور میں باقاعدہ بس سروس شروع کرنے کے معاہدے پر دستخط کئے۔ پاکستان کی طرف سے پاکستان کے دفاقی سیکرٹری مواصلات محمد اکرم شیخ اور بھارت کی طرف سے پاکستان میں بھارتی ہائی کمشنر جی پارتھا سارتھے نے معاہدے پر دستخط کئے۔ بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی ان مسافروں میں شامل تھے جو معاہدے کے مطابق شروع ہونے والی بس سروس کی پہلی بس سے ۲۰ فروری کو پاکستان پہنچے۔ پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف نے واہگہ بارڈر پر اپنے ہم منصب کا استقبال کیا۔ جناب واجپائی دو دن لاہور میں ٹھہرے۔ اپنے قیام کے دوران وہ مینار پاکستان بھی گئے اور ملاقاتیوں کی کتاب میں اپنے تاثرات قلمبند کئے۔ انہوں نے لکھا "ایک مضبوط، محفوظ اور خوشحال پاکستان کا وجود بھارت کے مفاد میں ہے"۔

دونوں وزرائے اعظم نے "اعلان لاہور" "پاک بھارت مشترکہ اعلامیے" اور "باہمی افہام وتفہیم کی یادداشت" پر دستخط کئے۔ جن میں جموں وکشمیر سمیت تمام حل طلب امور کو حل کرنے کے لئے ٹھوس کوششیں کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا۔ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے باز رہنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور فوری طور پر ایسے اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا کہ حادثاتی طور پر یا غیر مستند ذرائع سے ایٹمی ہتھیار استعمال نہ ہونے پائیں۔ اس بات سے بھی اتفاق کیا گیا تھا کہ دونوں ملکوں کے درمیان اعتماد کے فروغ کے لئے وسیع تر اقدامات کئے جائیں اور ایسی تعلیمات ونظریات کا پرچار کیا جائے جس کی وجہ سے دونوں ملکوں میں ایٹمی یا روائتی ہتھیاروں کی جنگ کی نوبت نہ آئے۔

جب وزیر اعظم نواز شریف اپنے ہم منصب سے مذاکرات میں مصروف تھے انہیں قطعاً معلوم نہیں تھا کہ چار جنرلوں کا گروپ شمالی علاقوں میں کن کارروائیوں میں مصروف تھا اور ان کی مہم جوئی ملک کو کس قدر نقصان پہنچائے گی۔ وہ دونوں ملکوں کے

مابین کشیدگی کم کرنے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف رہے۔

۹ مارچ ۱۹۹۹ء کو پاکستان اور بھارت نے اسلام آباد میں ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ اس معاہدے کے مطابق دونوں ملکوں کے تاجروں پر ویزے کی پابندیاں نرم کی جانی تھیں اور ایک دوسرے کے شہری قیدی رہا کئے جانے تھے۔ ۱۸ اور ۱۹ مارچ کو سری لنکا میں ہونے والی سارک ممالک کی وزارتی کونسل کے اجلاس کے موقع پر دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ نے ملاقات کی اور اس بات پر اتفاق کیا کہ:

۱۔ اپریل مئی ۱۹۹۹ء میں ماہرین کے اجلاس میں افہام وتفہیم کی اس یادداشت پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جائے جس پر لاہور میں دستخط ہوئے تھے۔

۲۔ مئی/جون میں وزرائے خارجہ دہلی میں ملاقات کریں اور کشمیر، فروغ امن اور سیکورٹی کے معاملات پر بحث کریں۔

۳۔ چھ دیگر امور پر متعلقہ ماہرین اسلام آباد میں جمع ہوں اور ان تنازعات کے حل پر غور کریں۔ ان امور میں سیاچن، وولر بیراج، سر کریک، دہشت گردی، منشیات کی روک تھام، اور اقتصادی امور میں تعاون جیسے امور شامل تھے۔

۲۲ مارچ کو بھارتی وزیر اعظم واجپائی نے پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف کو ایک خط لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ان کا ملک پاکستان سے امن اور دوستی کے تعلقات کا خواہاں ہے اور تمام متنازعہ معاملات کو خوش اسلوبی سے حل کرنا چاہتا ہے۔ ۱۱ اپریل کو وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ اعلامیہ لاہور کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان بہت سے امور پر مناسب پیش رفت ہوئی ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ معاملات اور آگے بڑھیں گے۔

جو بات پاکستانی وزیر اعظم کو نہیں معلوم تھی وہ یہ کہ پاک فوج کے کچھ مبہم جو جنرلوں کا اپنا ایک ایجنڈا تھا اور وہ ملک کے انتظامی سربراہ اور سپریم سول اتھارٹی سے اجازت حاصل کئے بغیر اس ایجنڈے پر خاموشی سے عمل پیرا تھے۔ وزیر اعظم ان لوگوں کی نمائندگی کرتا تھا جو مسلح افواج پر اٹھنے والے بھاری اخراجات کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ لائن آف کنٹرول کے پار فوجی دستوں کی تعیناتی کے بعد جنرل پرویز مشرف نے اس کا انکشاف ملیر چھاؤنی کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس مصنف نے اس موقع پر ان سے سوال کیا تھا کہ اس جارحانہ کاروائی کے کیا مقاصد ہیں۔ پہلے تو وہ خاموش رہے پھر اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے ایک سینئر افسر کے لقمہ دینے پر انہوں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور فرمایا کہ مسئلہ کشمیر پس پشت ڈال دیا گیا تھا اور اس کارروائی کا مقصد مسئلہ کشمیر کو نئے سرے سے اجاگر کرنا اور دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کرانا تھا۔ یہ بودی دلیل کئی مرتبہ دہرائی جا چکی ہے، ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی اس کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے اور کئی حاشیہ بردار بھی اس پر طبع آزمائی فرماتے رہے ہیں، لیکن گذشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت مسئلہ کشمیر سے غافل تھی نہ دنیا اس بارے میں لاتعلق تھی۔ اس مسئلے کو پورے عزت اور وقار کے ساتھ مناسب جگہوں پر اٹھایا جا رہا تھا اور اس کے حل کے لئے مسلسل کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اس دلیل کے برعکس، سانحہ کارگل نے مسئلہ کشمیر پر منفی اثرات مرتب کئے۔ یہ کارگل کے سانحے کے بعد کی بات ہے کہ بھارت نے کشمیر کی سرحدیں سیل کرنے کے لئے وہاں لوہے کی خاردار تاروں کی باڑ کھڑی کر دی۔ یہ اقوام متحدہ کی اس پالیسی کی صریح خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ متنازعہ علاقوں کی سرحدیں کسی دیوار، خاردار تاروں یا باڑ کے ذریعے سیل نہیں کی جا سکتیں۔ ہم اس معاملے میں کچھ نہ کر سکے۔ جمہوری طور پر منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر جن کاسہ لیسوں اور حاشیہ برداروں کی حکومت قائم کی گئی تھی وہ مسئلہ کشمیر کو جراتمندانہ طریق سے حل نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے کشمیر میں رائے شماری کے اس اصولی موقف سے دستبرداری اختیار کی جس پر ہم شروع سے قائم تھے اور جسے اقوام متحدہ کی تائید بھی حاصل تھی۔ اس کی بجائے انہوں نے بھارت کو نئے موقف پیش کئے۔ بھارت کو سرحدیں سیل کرنے میں امریکیوں کی تائید حاصل تھی اور اس کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ تاریخ میں پہلی بار امریکہ کے فوجی دستوں نے بھارتی فوج کے ساتھ مل کر مقبوضہ کشمیر میں مشترکہ فوجی مشقیں کیں۔

سینئر کمانڈر.........لائن آف کنٹرول کے پار

(شاید کوئی منطق ہو نہاں ' ان کے عمل میں)

مارچ کے وسط تک بالا کمانڈروں کی تسلی کے مطابق ضروری اشیاء اگلے علاقوں میں ذخیرہ کی جا چکی تھیں۔ اس کے فوراً بعد فوجی دستوں کو لشتم پشتم لائن آف کنٹرول کے پار بھیج دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں انہیں بلند علاقوں میں استعمال ہونے والے خصوصی جوتے بھی فراہم نہیں کئے گئے تھے۔ دیگر ساز و سامان کا تو ذکر ہی کیا حالانکہ اس کے بغیر وہاں زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کئی فوجی برف زدگی کا شکار ہو گئے۔ کتنے ہی سپاہیوں کو اپنے ہاتھوں، پیروں یا انگلیوں سے محروم ہونا پڑا کہ شدید سردی میں برف سب سے پہلے انہی اعضاء کو پہلے سن کرتی ہے اور بروقت علاج میسر نہ آئے تو انہیں کاٹے بنا چارہ نہیں۔ ۱۹ فروری کو میجر اسد، دو نان کمیشنڈ آفیسر اور سات سپاہی ایک برفشار کی زد میں آ کر شہید ہو گئے۔ ان کی نعشیں چھ دنوں بعد ۲۴ فروری کو برآمد کی جا سکیں۔ سینئر کمانڈر مطمئن تھے۔ انہوں نے جو جمع تفریق کر رکھی تھی اس میں ایسے حادثے قابل قبول تھے۔

۱۳ مارچ ۱۹۹۹ء کو ایف سی این اے میجر جنرل جاوید حسن نے ۱۲ - این ایل

آئی کے قائم کردہ ذکریا مستقر اور مڈل پوائنٹ کا معائنہ کیا۔ کسی سینئر پاکستانی کمانڈر کی طرف سے لائن آف کنٹرول کے پار، یہ پہلا دورہ تھا۔ انہوں نے یونٹ کے جوانوں کو شاباش دی اور مزید آگے بیٹھے ہوئے چوکی کمانڈروں سے بھی فون پر گفتگو کی۔ ۲۶ مارچ کو وہ دوبارہ اس علاقے میں آئے۔ اس بار ان کے ساتھ ۸۰ برگیڈ کے کمانڈر، برگیڈیر (اب لیفٹیننٹ جنرل) مسعود اسلم، ۳۲۳ برگیڈ کے کمانڈر، ڈویژنل آرٹلری کمانڈر بریگیڈیر جمیل حیدر، ایف سی این اے کے سٹاف آفیسر لیفٹیننٹ کرنل نثار بھی تھے۔ دراصل یہ دورہ مزید سینئر کمانڈروں کے دوروں کا پیش خیمہ تھا۔

ٹھیک دو دنوں بعد ۲۸ مارچ ۱۹۹۹ء کو صبح دس بجے گلتری میں ایک ہیلی کاپٹر اترا اور اس سے برآمد ہونے والا پہلا شخص تھا چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف۔ ان کے ساتھ دسویں کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود، چیف آف جنرل سٹاف محمد عزیز خان، کمانڈر ایف سی این اے میجر جنرل جاوید حسن، چیف آف آرمی سٹاف کے پرسنل سیکرٹری اور ایف سی این اے ہیڈ کوارٹر کے ایک سٹاف آفیسر۔ ۸۰ برگیڈ کے کمانڈر برگیڈیر مسعود اسلم نے ان کا استقبال کیا۔

ایف سی این اے کمانڈر میجر جنرل جاوید حسن خوشی سے تمتما رہے تھے اور اپنی کامیابیاں چیف کو دکھانے کے لئے بے تاب۔ یہی حال برگیڈ کے کمانڈر برگیڈیر مسعود کا تھا جو اس بات میں اپنی عزت افزائی محسوس کر رہے تھے کہ چیف نے اپنے دورے کیلئے سب سے پہلے ان کے "فتح کردہ" علاقے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ جلد از جلد چیف کو لائن آف کنٹرول کے پار لے جا کر وہ سارے علاقے دکھانا چاہتے تھے جو انہوں نے (دشمن کی غیر موجودگی میں) فتح کیے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو جلدی جلدی چائے اور ہلکے پھلکے لوازمات پیش کئے گئے اور پھر عزت مآب مہمان لاما ہیلی کاپٹروں میں بیٹھ کر لائن آف کنٹرول کے پار سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان کی اگلی منزل لائن آف کنٹرول سے ۱۱ کلومیٹر آگے واقع ذکریا مستقر تھا جہاں وہ ۱۰ بج کر ۴۰ منٹ پر

اترے۔ ۱۲- این ایل آئی کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل امجد شبیر، نائب کماندار میجر طارق اور یونٹ کے ایڈ جوٹنٹ کیپٹن ریحان بشیر نے ان کا استقبال کیا۔

اس موقع پر فوجی جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے فرمایا، "ہم دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائیں گے جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے گا"۔ انہوں نے جوانوں کو شاباش دی اور کہا کہ یلدرم (۱۲ این ایل آئی کا عرفی نام) کے جوانوں کو تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اپریشن کی تکمیل کے بعد ان کی یونٹ کو بیٹل آنرز اور نشان (پاکستان کا پرچم) عطا کیا جائے گا۔ خطاب کے بعد چیف آف آرمی سٹاف نے اردگرد کا مزید مفتوحہ علاقہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ انہیں ایک لاما ہیلی کاپٹر میں اردگرد کے علاقے کی سیر کرائی گئی۔ اس سے ان کے شوق کو مہمیز ملی اور انہوں نے رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن عید الاضحیٰ تھی جو چیف آف آرمی سٹاف اور دوسرے سینئر افسروں نے لائن آف کنٹرول کے پار ۱۲- این ایل آئی کے جوانوں کے ساتھ منائی۔ پاکستان کے آئینی سربراہ اور سپریم اتھارٹی وزیر اعظم نواز شریف یا حکومت کے کسی اعلیٰ عہدیدار کو اب تک ان سرگرمیوں اور جنرلوں کی مہم جوئی کی قطعاً کوئی خبر نہیں تھی اور وہ داخلی اور سفارتی محاذ پر ایٹمی دھماکوں کے بعد مثبت نتائج کو مستحکم کرنے اور اعلان لاہور میں طے ہونے والے نکات کے مطابق بھارت سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

۱۱ اپریل کو وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ اعلان لاہور کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات میں مناسب پیش رفت ہوئی ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ معاملات مزید آگے بڑھیں گے۔

۱۵ اپریل کو پاکستان نے زمین سے زمین پر مار کرنے والے شاہین میزائل کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس میزائل کی رینج ۶۰۰ کلومیٹر تھی۔

مگر یہ بات چھپانے سے کب چھپی رہتی

لائن آف کنٹرول کے پار جانے والے فوجی دستوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جون سے پہلے دشمن کو ان کی موجودگی کا بالکل پتہ نہیں چلے گا۔ اس وقت تک برف پگھلنے لگے گی، درجہ حرارت بہتر ہو جائے گا اور دشمن کے اکا دکا فوجی بتدریج واپس آئیں گے۔ ان سے نمٹنا آسان ہو گا کیونکہ جب تک ہم اپنی چوکیوں کو خوب مضبوط کر چکے ہوں گے اور پورے علاقے میں اتنے مستحکم ہو چکے ہوں گے کہ دشمن ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد نے ایک مرتبہ بریگیڈ کمانڈروں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا، ''دشمن ہماری موجودگی کو برداشت کرنا سیکھ جائے گا''۔

یونٹوں کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ وہ کسی بھی حالت میں فائر نہ کھولیں مبادا ہماری چوکیوں کا راز فاش ہو جائے۔

حالات' توقعات کے برعکس ثابت ہوئے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کس یونٹ کے کون افراد سب سے پہلے دشمن کی نظر میں آئے، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مئی ۱۹۹۹ء کے پہلے ہفتے میں بھارت کو پاکستانی فوجیوں کے لائن آف کنٹرول پار کرنے کی خبر ہو گئی تھی۔ ۵ مئی کے بھارتی اخبار میں یہ خبر چھپی کہ بھارتی فوج کے دستوں نے گشت کے دوران کشمیر میں کارگل کی پہاڑیوں پر ''گھس بیٹھیے'' دیکھے ہیں اور فوج نے ان

کے مقبوضہ علاقے خالی کرانے کے لئے اپریشن کا آغاز کر دیا ہے۔ دوسرے دن پاکستان کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا کہ پاک فوج نے شائیوک سیکٹر میں بھارتی فوج کا ایک حملہ پسپا کر دیا ہے۔

۸ مئی کو ٦ این ایل آئی کے کیپٹن افتخار اعظم چوکی پر تھے جب انہیں یہ خبر ملی کہ دشمن کو ان کی اور دوسری یونٹوں کی دراندازی کی خبر ہو گئی ہے اور دشمن کے ہیلی کاپٹروں نے کئی علاقوں میں پرواز کر کے ان کی چوکیاں دیکھ لی ہیں۔ اس وقت ان کے ساتھ لانس حوالدار عبدالحکیم اور مزید ۱۲ افراد تھے۔ ۹ مئی کو انہوں نے کئی گڈریوں کو اپنے اردگرد کے علاقے میں بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ساتھ خونخوار کتے بھی تھے۔ یہ ایک معمول ہے۔ جانوروں کو مطلوبہ علاقے میں محدود رکھنے اور ریوڑ سے الگ ہو جانے والی بھیڑ بکریوں کو ریوڑ میں واپس لانے میں کتے بڑی مدد کرتے ہیں۔ کیپٹن افتخار نے گڈریوں کو دیکھا تو لانس حوالدار عبدالحکیم سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ عبدالحکیم کا مشورہ تھا کہ کتوں کو گولی مار دی جائے اور گڈریوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ کیپٹن افتخار نے سوچا وہ مسلح تھے اور نہتے گڈریوں کو گرفتار کرنا اور کتوں کو گولی مار ڈالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن اس کے بعد..........؟ فائر کھولنے سے آواز دور دور سنائی دیتی، جسے نہ بھی خبر ہوتی وہ چوکنا ہو جاتا اور گرفتار شدہ گڈریے بھی ایک مسئلہ کھڑا کرتے۔ اگر وہ انہیں گرفتار کر کے چوکی پر ہی رکھتے تو انہیں کھلانا پلانا بھی پڑتا اور راشن کی مقدار پہلے ہی محدود تھی۔ اور اگر انہیں بٹالین ہیڈ کوارٹر بھیجا جاتا تو انہیں دو تین ساتھیوں سے محروم ہونا پڑتا۔ فاصلہ طویل تھا اور پر پیچ۔ اگر گڈریوں نے پھرتی دکھائی کہ وہ ان راستوں سے زیادہ واقف تھے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کیپٹن افتخار نے خاموش رہ کر انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ دم سادھے بیٹھے رہے۔ کیپٹن افتخار نے ایک گڈریے کو طارق چوکی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے واپس آتے ہوئے بھی۔ وہ شاید وہاں پاکستانی

فوجیوں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس وقت صبح کے نو بجے کا وقت ہو گا۔ گڈریا طارق چوکی والی پہاڑی سے نیچے اترا اور پھر نشیب و فراز کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ واپس آیا۔ اس کے ساتھ بھارتی فوج کے چھ سات سپاہی بھی تھے۔ ان کے پاس چھوٹے ہتھیار اور دوربینیں تھیں۔ انہوں نے مختلف جگہوں سے دوربینوں سے پورے علاقے کا جائزہ لیا اور پھر واپس چلے گئے۔ دو بجے کے قریب ایک لاما ہیلی کاپٹر آیا۔ نیچی پرواز کرتے ہوئے اس نے تولولنگ پہاڑی کے اوپر کئی چکر لگائے۔ کیپٹن افتخار کا کہنا ہے کہ ہیلی کاپٹر اتنی نیچی پرواز کر رہا تھا کہ اسے پائلٹ کی ٹوپی کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو جو علاقے کا کوئی سینئر افسر رہا ہو گا، مختلف سمتوں میں اشارہ کرتے ہوئے چوکیوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ دوسرے دن دو ہیلی کاپٹر آئے اور انہوں نے اعظم، طارق، اور تاشفین چوکیوں پر فائرنگ کی۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی گئی اور فائر کھولنے کی اجازت مانگی گئی۔ لیکن درخواست مسترد کر دی گئی، کہ اس سے دشمن کو ہماری چوکیوں کی خبر ہو جائے گی اور حیرانگی کا عنصر جاتا رہے گا۔

دوسرے دن یعنی ۱۱ مئی کو کئی ہیلی کاپٹر آئے اور مختلف سمتوں میں پرواز کرتے ہوئے وہ پورے علاقے میں منڈلاتے رہے۔ جب کوئی جوابی کارروائی نہ ہوئی تو وہ دلیر ہو کر اور نیچے اتر آئے۔ کچھ چوکیوں پر انہوں نے دستی بم بھی پھینکے۔ بلند علاقوں میں استعمال ہونے والے کئی خیموں کو آگ لگ گئی اور کافی ساز و سامان تباہ ہو گیا۔ تولولنگ اور تاشفین چوکیوں کے پاس میزائل بھی تھے جب کہ کیپٹن افتخار کے پاس صرف ایک لائٹ مشین گن اور چند شین گنیں تھیں یا جی تھری رائفلیں جو ہیلی کاپٹروں پر موثر فائر نہیں کر سکتی تھیں۔ اس وقت تک ان تینوں چوکیوں کے درمیان مواصلاتی رابطہ موجود تھا۔ کیپٹن افتخار نے دوسری چوکیوں سے پوچھا کہ وہ ہیلی کاپٹروں پر میزائل فائر کیوں نہیں کرتے۔ جواب ملا کہ انہیں فائر کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

جنگ شروع ہو چکی تھی اور کس عجیب انداز میں۔

مختلف یونٹوں کی طرف سے ہیڈ کوارٹر میں اطلاعات پہنچیں کہ ان کی چوکیوں کے بارے میں دشمن کو خبر ہو گئی ہے۔ اور ان کے ہیلی کاپٹر پورے علاقے میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے بالا کمانڈروں کی پیش بینی تو یہ تھی کہ دشمن کو ان کی سرگرمیوں کی اطلاع جون سے پہلے نہیں ہو سکے گی۔ اب جب دشمن کو یہ خبر ان کے اندازوں سے پہلے ہی ہو گئی تھی تو انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ شروع شروع میں تو یہ جاننے کے باوجود کہ دشمن کے ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتے ہوئے چوکیوں پر فائر کر رہے ہیں، دستی بم پھینک رہے ہیں اور اپنے دستوں کی تمام سرگرمیاں ان کے براہ راست مشاہدے میں آگئی ہیں، بالا کمانڈروں کا اصرار تھا کہ فائر نہ کھولا جائے۔ شتر مرغ والی بات۔ تاہم جب چاروں طرف سے ایک سی اطلاعات وصول ہوئیں کہ دشمن کو ہماری آمد کی اطلاع ہو گئی ہے اور ہماری چوکیاں دیکھ لی گئی ہیں، کافی تاخیر کے بعد فائر کھولنے کی اجازت مرحمت فرما دی گئی۔



حکومت پاکستان اور جرنیلوں کی مہم جوئی

۵ مئی ۱۹۹۹ء منگل کا دن تھا، شام کا وقت۔ سیکرٹری دفاع لیفٹیننٹ جنرل افتخار علی خان (ریٹائرڈ) اپنی رہائش گاہ پر بیٹھے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ راکھ دان میں سگریٹ پڑا تھا اور ان کے ہاتھوں میں کوئی غیر ملکی رسالہ۔ سرسری انداز میں رسالے کو الٹتے پلٹتے، اچانک وہ چونک اٹھے۔ ان کی نگاہ ایک خبر پر جم کر رہ گئی۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر دنیا کے بلند ترین محاذ پر بھارت اور پاکستان کے درمیان فوجی جھڑپیں۔ اس طرح کی کوئی بات ہوتی تو سب سے پہلے انہیں خبر ہونی چاہیے تھی۔ شام کا وقت تھا اور جی ایچ کیو کے تمام بڑے دفاتر بند ہو چکے تھے، لیکن دفاعی امور کے لیے کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔ یہ فرض تو چوبیس گھنٹے نبھایا جاتا ہے۔ انھوں نے فوری طور پر ڈائریکٹر جنرل ملٹری اپریشنز میجر جنرل توقیر ضیاء سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ شمالی علاقوں میں کیا ہو رہا ہے۔ ”کچھ نہیں سر“ فوری جواب ملا۔

جب جنرل افتخار نے ڈی جی اپریشنز کو بتایا کہ انہوں نے ابھی ایک غیر ملکی مضمون پڑھا ہے جس میں پاکستان اور بھارت کے مابین فوجی جھڑپوں کا ذکر ہے تو ڈی جی نے کہا کہ وہ چیک کر کے انہیں بتائیں گے۔ شام گزر گئی، رات بھی۔ ڈی جی نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ دوسرے دن سیکرٹری دفاع نے خود ہی فون کیا اور پوچھا کہ ڈی

جی نے متعلقہ معلومات حاصل کی ہیں یا نہیں۔ڈی جی اپریشنز نے ان کے سوالات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر اور شمالی علاقوں میں چھوٹی موٹی جھڑپیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں، تشویش کی کوئی بات نہیں۔ جنرل افتخار مطمئن نہیں ہوئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ انہیں مکمل تفصیلات فراہم کی جائیں۔

انہی دنوں نواز شریف کو اپنے بھارتی ہم منصب کی طرف سے فون آیا کہ آپ نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ حیران ہو کر نواز شریف نے تفصیل جاننا چاہی تو واجپائی نے انہیں شمالی علاقوں میں پاکستانی فوجی دستوں کی دراندازی سے آگاہ کیا۔ نواز شریف نے سیکرٹری دفاع لیفٹیننٹ جنرل (ر) افتخار علی خان سے پوچھا کہ انہیں اس بارے میں کوئی خبر ہے، تو انھوں نے بتایا کہ انہیں کچھ خبریں تو ملی ہیں لیکن وہ تفصیلات ملنے پر وزیر اعظم کو مہیا کریں گے۔

دو دنوں بعد جنرل افتخار کو بتایا گیا کہ بہت جلد وزیر اعظم کے لیے ایک بریفنگ کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس میں انہیں بھی مدعو کیا جائے گا۔ یہ بریفنگ ۱۷ مئی ۱۹۹۹ء کو بروز اتوار انٹر سروسز انٹیلی جنس کے اوجڑی کیمپ کے دفاتر میں منعقد ہوئی۔ حکومت کی طرف سے نواز شریف، سیکرٹری دفاع لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) افتخار علی خان، وزیر خارجہ سرتاج عزیز، وفاقی وزیر لیفٹیننٹ جنرل (ر) مجید ملک، سیکرٹری برائے امور خارجہ مسٹر شمشاد احمد خان اور وزیر اعظم کے پرسنل سیکرٹری سعید مہدی موجود تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف کے ساتھ چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان، دسویں کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد، ڈائریکٹر جنرل ملٹری اپریشنز میجر جنرل توقیر ضیاء، کمانڈر ایف سی این اے میجر جنرل جاوید حسن اور آئی ایس آئی سے میجر جنرل (بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل، کمانڈر ۱۰ کور) جمشید گلزار موجود تھے۔

ڈی جی اپریشنز میجر جنرل توقیر ضیاء نے بریفنگ دی جس میں فوجی صورت حال کی بڑی پرکشش تصویر کشی کی گئی تھی۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ پاک فوج نے علاقے

کی اہم چوٹیوں پر قبضہ کر کے مکمل سرپرائز حاصل کی ہے اور بھارتی فوج کسی بھی طرح مقبوضہ چوکیاں واپس نہیں لے سکتی۔ حکومت کی طرف سے دفاعی امور کو سمجھنے والے ماہرین جنرل افتخار اور جنرل مجید تھے جنہوں نے بڑے چبھتے ہوئے سوال کیے جو فوجی کمانڈروں کو پسند نہیں آئے۔ تاہم ان کی تنقید کے جواب میں کہا گیا کہ بھارت بین الاقوامی سرحدوں پر جنگ چھیڑنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ چونکہ بھارتی فوج کشمیر اور شمالی علاقوں میں بری طرح الجھی ہوئی ہے اس لیے وہ زمینی، بحری یا فضائی حدود کی خلاف ورزیاں کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ دعویٰ کیا گیا کہ بھارتی فوج زبردست عددی برتری کے باوجود ناردرن لائٹ انفنٹری کے دستوں کو بے دخل کر کے کسی بھی طرح مقبوضہ چوکیاں واپس نہیں لے سکتی۔



یلغار

جب بھارت کے فوجی کمانڈروں کو دراندازی کی خبر ہوئی تو وہ سخت مشتعل، برہم اور برافروختہ ہوئے۔ ان کے غضب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے این ایل آئی کے دستوں اور مجاہدین کو ان کی قائم کردہ چوکیوں سے بے دخل کرنے کے لیے فوری منصوبہ بندی کی اور جیسا کہ بھارتی فوج کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل وی پی ملک نے "انڈین ڈیفنس ریویو" کے سولہویں شمارے میں چھپنے والے ایک مضمون" کارگل سے (سیکھے جانے والے) سبق میں لکھا ہے، اس اپریشن کو "وجے" کا نام دیا گیا تھا۔ ان کا ردعمل تیز اور شدید بھی تھا، خشمناک بھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنی بہترین "بوفور" توپیں پہاڑوں پر چڑھا لائے بلکہ مقبوضہ کشمیر میں موجود فضائیہ کی تعداد میں بھی چار گنا اضافہ کر دیا۔ پہلے وہاں ان کا صرف ایک سکواڈرن تھا، اب انہوں نے سرینگر، اوانتی پور، لیہ اور اودھم پور کے ہر اڈے پر ایک ایک سکواڈرن تعینات کر دیا۔ اس کے برعکس پاکستان میں پاک فضائیہ کو ابھی تک اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔

فضائیہ کے سربراہ کو قطعاً خبر نہ تھی کہ شمالی علاقوں میں کیا ہو رہا ہے۔ لائن آف کنٹرول کے پار سرگرمیاں ابھی تک خفیہ رکھی گئی تھیں۔ جنرل پرویز مشرف اس راز داری کے دفاع میں کہتے ہیں، " سیکورٹی بڑی ضروری تھی ...اس لیے اطلاع صرف

اسے دی گئی جسے جاننے کی ضرورت تھی" (صفحہ ۹۰، ان دی لائن آف فائر)۔ پاک فضائیہ کے سربراہ کو یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ شمالی علاقوں سے پاکستان کی فضائی حدود کو کیا خطرات لاحق ہیں!!!

۱۲ مئی کو ۶۔ این ایل آئی کے علاقے میں دو ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے۔ ایک جمال چوکی کی طرف چلا گیا، دوسرا اعظم چوکی (تولولنگ) کی طرف آیا۔ تولولنگ سے زمین سے فضا میں مار کرنے والے (سام) میزائل داغے گئے لیکن نشانہ چوک گیا۔ نشانہ خطا ہونا بھی ایک نقصان تھا لیکن اس سے کہیں بڑا نقصان کچھ اور تھا۔ ایک عجیب وغریب بات ہوئی جو اس سے قبل مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔ سردی اس قدر زیادہ تھی کہ جب میزائل داغے گئے تو ان سے نکلنے والا دھواں منجمد ہو گیا اور اس نے آسمان پر ایک قوس سی بنا دی جس کا ایک سرا اس سمت اشارہ کر رہا تھا، جہاں سے میزائل داغے گئے تھے۔ دشمن کی مشاہداتی چوکیوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ۔ چند لمحوں بعد ہی بھارتی توپخانے نے ان چوکیوں پر گولوں کی بارش کر دی۔ تین سپاہی بری طرح زخمی ہوئے۔ کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر دوبارہ آئے اور تمام چوکیوں کی عکس بندی کی گئی۔ بعد ازاں یہ فلم زی ٹی وی پر دکھائی گئی۔ دوسری چوکیوں سے لائٹ مشین گن اور شین گنوں سے فائر کیا گیا، لیکن ظاہر ہے ان کی فائرنگ ہیلی کاپٹروں کے خلاف موثر نہیں تھی، لیکن ہیلی کاپٹروں کو پہلی بار مزاحمت سے سابقہ پڑا وہ واپس چلے گئے۔ دو بج کر دس منٹ پر بھارتی توپخانے کے کچھ گولے اعظم پوسٹ اور اردگرد کے علاقے میں گرے۔ اس کے بعد جو بھارت کے بھاری توپخانے نے گولے برسانے شروع کیے تو شام تک تھمنے کا نام نہیں لیا۔ پھر یہ گولہ باری افتخار مشاہداتی چوکی، طارق، اقبال اور دوسری چوکیوں کی طرف شفٹ ہو گئی۔

دوسرے دن یعنی ۱۳ مئی کو گولہ باری کا آغاز پو پھٹتے ہی شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ سارا دن جاری رہا۔ کیپٹن افتخار اور ان کے ساتھیوں نے اپنی چوکیوں سے ہٹ

کر بڑے بڑے تودوں کے پیچھے پناہ لے رکھی تھی اس لیے وہ محفوظ رہے۔ کارگل دراس روڈ پر انہوں نے چھ توپیں اور دو سو کے قریب گاڑیاں کھڑی دیکھیں جن میں ڈھائی ٹن ٹرک اور سات ٹن کی توپیں کھینچنے والی گاڑیاں شامل تھیں۔ ان کے پاس صرف انفنٹری میں استعمال ہونے والے ہلکے پھلکے ہتھیار تھے جن کی مار کا فاصلہ ویسے بھی زیادہ نہ تھا۔ وہ ان توپوں اور گاڑیوں کا کچھ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر سے درخواست کی کہ اپنے توپخانے سے ان پر گولہ باری کروائی جائے۔ جواب ملا کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس سے کہیں بڑا ٹارگٹ سامنے آئے گا، اس کے خلاف یقیناً کارروائی کی جائے گی۔

وہ ٹارگٹ تو کبھی نظر نہیں آیا البتہ یونٹ کو دشمن کی زبردست یلغار کا سامنا کرنا پڑا۔ سارا دن دشمن کا توپخانہ ان پر آگ برساتا تھا اور رات کو پیدل فوج کے دستے چاروں طرف سے لہر در لہر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یونٹ کے افراد کو سستانے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ جنگ کے اختتام تک یونٹ کے ۴۳ افراد شہید اور ۱۱۵ زخمی ہو چکے تھے۔

۱۲۔ این ایل آئی کے علاقے میں کیپٹن کرنل شیر پوری بے باکی سے ریکی اور دشمن کے خلاف گھات لگانے کی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ ۳ مئی کو وہ حوالدار وزیر اللہ اور دو مزید سپاہیوں کو لے کر ریکی کے لئے گئے۔ اس سے اگلے روز انہوں نے مساحتی حوالے ۲۸۶۲ کے علاقے میں ریکی کی۔ ۵ اور ۶ مئی کو انہوں نے موئی مستقر سے مختلف اپریشن کیے اور ان کے نتائج سے کمانڈنگ آفیسر کو مطلع کیا۔ کمانڈنگ آفیسر کی ہدایت پر انہوں نے ۱۲ مئی کو مساحتی حوالے ۲۸۷۶۲۶ کے علاقے میں ایک چوکی قائم کی۔ ان کی سرگرمیاں دشمن کے لیے وبال جان بن گئیں تو ۱۳ مئی کو ان کے خلاف تابڑ توڑ اقدام کا فیصلہ کیا گیا۔ پہلے بھارتی توپخانے نے اندھا دھند بمباری کی اور پھر یہ سوچ کر کہ پاکستانی فوجی زخمی ہو چکے ہوں گے یا چوکیاں خالی کر

چکے ہوں گے، ایک سیکشن کی نفری (نو دس افراد) ہیلی کاپٹر کی مدد سے چوکی کے عین سامنے اتارے گئے۔ کیپٹن کرنل شیر اور ان کے ساتھیوں نے بمباری سے بچنے کے لیے آڑ تو لی تھی لیکن ان کے حوصلے جوان تھے۔ بھارتی فوج کے اترتے ہی انہوں نے اپنی چوکیاں سنبھالیں اور ان پر فائرنگ کی بوچھاڑ کر دی۔ چند آدمی مارے گئے، باقی بھاگ نکلے۔

سپاہی عبد القادر بریوو کمپنی میں تھا۔ ایثار اور قربانی کے احساسات سے مزین یہ شخص شہادت کا تمنائی تھا۔ ۲۷ مئی کو انہیں لانس نائیک عبد المجید اور سپاہی غلام محمد ڈار کے ساتھ تولولنگ کی چوٹیوں کی طرف بھیجا گیا۔ یہاں کیپٹن عامر چوکیوں کی کمان کر رہے تھے۔ ان چوکیوں پر دشمن نے کئی بار حملے کیے لیکن پاک فوج کے جوان چٹان کی طرح ڈٹے رہے اور ان حملوں کو پسپا کرتے رہے۔ توپخانے کی بمباری کے دوران سپاہی عبد القادر بے خطر گھومتا پھرتا تھا اور ایک ایک مورچے کے پاس جا کر اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھاتا تھا اور انہیں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک بم کا ایک ٹکڑا ان کے بازو میں آ لگا لیکن انہوں نے اسے کھینچ کر باہر نکالا، خود ہی اس پر پٹی کی اور معمول کی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے ۱۲ جون کو دشمن کی ایک بٹالین نے تولولنگ پر بھرپور یلغار کی۔ بڑھتے ہوئے دشمن کو روکنے کے لیے سپاہی عبد القادر آگے بڑھ کر فائرنگ کر رہے تھے کہ ایک گولی ان کے سر میں لگی۔ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ دشمن سے دس قدم کے فاصلے پر تھے جب زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے گر پڑے اور شہید ہو گئے۔

۲۹ مئی ۱۹۹۹ء کو قائم مقام چیف آف آرمی سٹاف لیفٹیننٹ جنرل سعید الظفر (کمانڈر ۱۱ کور) ۱۲۔ این ایل آئی کے علاقے میں آئے۔ ۱۰ کور کے کمانڈر، لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد، ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز میجر جنرل توقیر ضیاء، ڈائریکٹر جنرل ایوی ایشن اور کمانڈر ایف سی این اے، ان کے ہمراہ تھے۔

دوسرے دن ۳۰ مئی کو سیکرٹری دفاع لیفٹیننٹ جنرل (ر) افتخار علی خان نے ۱۲۔ این ایل آئی کا دورہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ حکومت کا کوئی اعلیٰ عہدیدار اگلے علاقوں میں کسی لڑاکا یونٹ کے افراد سے ملنے آیا۔ پاک فضائیہ کی بھی یہی صورت تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان ایئر فورس کے کسی اعلیٰ افسر، ایئر مارشل زاہد انیس، ڈپٹی چیف آف ایئر سٹاف (آپریشنز) کو کارگل آنے کی دعوت دی گئی۔ چیف آف جنرل سٹاف، لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان، کمانڈر آرمی ایئر ڈیفنس، لیفٹیننٹ جنرل افتخار حسین شاہ اور ڈائریکٹر جنرل ملٹری انٹیلی جنس میجر جنرل بعد (ازاں جنرل، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف آرمی سٹاف کمیٹی) احسان الحق بھی ان کے ہمراہ تھے۔

۴ جون ۱۹۹۹ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے پھر ۱۲ این ایل آئی کا دورہ کیا۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ انسپکٹر جنرل ٹریننگ اینڈ ایویلوایشن لیفٹیننٹ جنرل افضل جنجوعہ، ۳۰ کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آغا جہانگیر، ۱۰ کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد اور کمانڈر ایف سی این اے تھے۔

۱۲ جون کو رات بھر کی خون آشام جنگ کے بعد دشمن نے تولولنگ کی چوٹیاں خالی کروالیں۔ بھارتی رسالے "انڈیا ٹوڈے" کے ۵ جولائی ۱۹۹۹ء کے شمارے میں ان کے جنگی وقائع نگار کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی۔ چند اقتباسات:

"تولولنگ کی جھڑپ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی کمانڈروں نے دراندازوں کی قوت اور مزاحمت کی صلاحیت کا کتنا غلط اندازہ لگایا تھا۔ جب ۱۴ مئی کو دراس سیکٹر میں دراندازی کی خبر ملی تو ۱۸ گرنیڈیر بٹالین کو وادی کشمیر میں دہشت گردی کے خلاف کارروائیوں سے ہٹا لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ دراس سیکٹر میں دراندازوں کو بے دخل کریں۔

بالکل آغاز میں ایک بریفنگ کے دوران کارگل کے بریگیڈ کمانڈر نے بڑی خشونت سے گرنیڈیر بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر سے کہا، " اوپر جاؤ اور انہیں گردنوں

سے پکڑ کر نیچے لاؤ"۔

ناگا، گڑوال اور گرنیڈیر کی تین بٹالین نفری نے دو اطراف سے تو لو لنگ کی پہاڑیوں پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن زبردست جوابی فائرنگ کی وجہ سے کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔ حالات اتنے گھمبیر تھے کہ ایک اور گرنیڈیر بٹالین کی دو پلاٹونیں سولہ دنوں تک تو لو لنگ کی پہاڑیوں کے نیچے پھنسی رہیں۔ اس لیے کہ چوٹیوں پر موجود دراندازان پر توپخانے کی اور اپنے ہتھیاروں کی اتنی صحیح فائرنگ کرواتے تھے کہ انہیں سر اٹھانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

تو لو لنگ پر قبضہ راجپوتانہ رائفلز کے مقدر میں لکھا تھا جس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل ایم بی راوندر ناتھ کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۳ جون کو صبح ۴ بجکر دس منٹ پر انہوں نے ۸ ماؤنٹین ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل مہندر پوری کو اپنی کامیابی کی اطلاع دی"۔

تو لو لنگ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہمارے فوجی دستوں کا اس علاقے میں ٹھہرنا مشکل تھا اس لیے ۶-این ایل آئی کو واپسی کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ تاشفین چوکی ۲۲ جون کو چھوڑ دی گئی۔ طارق اور غلام جان چوکیاں ۲۸ اور ۲۹ جون کو خالی کر دی گئیں۔ ان چوکیوں پر خونریز معرکوں کی تفصیلات ایک اور باب میں بیان کی گئی ہیں۔ پسپائی مشکل اپریشن ہوتا ہے۔ دشمن کو مصروف رکھتے ہوئے کچھ دستوں کو واپسی کا حکم دیا جاتا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل سلیم نے تو لو لنگ کھونے کے بعد یونٹ کی کمان سنبھالی تھی، جب یونٹ کو پسپائی کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ انہوں نے بڑی مہارت سے صورت حال کو قابو میں رکھا اور پورے اپریشن کو اس نظم و ضبط کے ساتھ مکمل کیا کہ سارا ساز و سامان، اسلحہ اور بارود بحفاظت واپس آ گیا۔ ذوہ سمیت تمام جانور تک واپس لائے گئے۔

تو لو لنگ کے بعد دشمن نے جمال چوکی کی طرف توجہ دی جو تو لو لنگ (اعظم چوکی) کے پیچھے واقع تھی۔ اس چوکی کو میجر ارشد کمان کر رہے تھے۔ انہوں نے ۱۲

جون کو بنیال میں یونٹ رپورٹ کی تھی، پہلے انہیں زاہد چوکی کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن بعد میں جمال چوکی کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے آتے ہی پوری صورت حال کا جائزہ لیا۔ ان کی چوکی ایک تنگ سی جگہ پر واقع تھی جہاں بمشکل ایک مورچے کی گنجائش تھی۔ وہ مورچہ پہلے ہی تیار کر لیا گیا تھا اور غالباً کھدائی کرنے والے کے نام پر اسے "مہدی بنکر" سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس کے پیچھے تقریباً ۷۵ گز کے فاصلے پر ایک مشاہداتی چوکی بنائی گئی تھی۔ دونوں جگہوں پر ۱۱ افراد موجود تھے۔ ان کے پاس لائٹ مشین گن کی ۲۵۰۰ گولیاں اور ۷۔۱۲ بور مشین گن کی ۵۲۰ گولیاں، سب مشین گن کے ۱۲ میگزین اور ۲ انچ مارٹر کے ۱۲ ناکارہ گولے تھے۔ راشن میں ان کے پاس صرف ۳ کلو آٹا، اور ڈیڑھ کلو دال تھی۔ کھانا بنانے یا سردی سے محفوظ رہنے کو چولہے جلانے کے لیے مٹی کا تیل ندارد۔ میجر ارشد نے سکردو سے گزرتے ہوئے کچھ خشک میوہ جات خرید لیے تھے جو ابھی تک ان کے پاس محفوظ تھے۔ جوانوں کے پاس ٹافیاں اور کچھ مٹھائی تھی۔ اس سب کچھ کو اکٹھا کر لیا گیا اور بڑی کفایت سے سب مل کر کھاتے تھے کہ جسم و جان کا رشتہ باقی رہے۔ ان کے پاس صرف ایک وائرلیس سیٹ پی آر سی ۷۷ تھا۔ اس کی بیٹری ڈسچارج ہوئے عرصہ گزر گیا تھا اور ری چارج کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان حالات میں ان کا کسی اور چوکی سے رابطہ تھا نہ اپنی بٹالین کے ہیڈ کوارٹر سے۔ انہیں اپنی جنگ آپ لڑنی تھی اور اپنے فیصلے خود ہی کرنے تھے۔ میجر ارشد نے یہ ساری صورتحال لکھی اور اسلحہ بارود اور خوراک کی ڈیمانڈ ایک پرچے پر تحریر کر کے پچھلی چوکی کی طرف بھجوائی، اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ ڈیمانڈ کمانڈنگ آفیسر تک پہنچا دی جائے۔ جب وہ اس کارروائی میں مصروف تھے تو تو لو لنگ پر خونریز جھڑپ جاری تھی۔

دوسرے دن حوالدار نوری چند جوانوں کے ساتھ تو لو لنگ سے پسپائی اختیار کرتے ہوئے ان تک پہنچا۔ اس نے بتایا کہ ان کے ساتھ جو توپخانے کا ابزرور تھا وہ

توپخانے کی فائرنگ کی براہ راست زد میں آکر شہید ہو گیا ہے۔ ۱۴ جون کو دشمن نے ان کے ٹھکانوں پر بمباری شروع کر دی۔ شدید فائرنگ کے بعد پیدل دستوں نے مختلف سمتوں سے ان کی طرف بڑھنا شروع کیا لیکن ان کی پیش قدمی ناکام بنا دی گئی۔ ان کے پاس جو آٹا اور دال موجود تھی، اسے پکانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کسی قسم کی کوئی کمک آنے کی امید نہ تھی۔ وہ تین دن تک بھوکے پیاسے لڑتے رہے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ سپاہی طارق کو توپخانے کے ایک بم کا ایک ٹکڑا آ لگا جس سے اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے لیے مرہم پٹی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا، لیکن آفرین ہے اس نوجوان پر کہ وہ کوئی گلہ شکوہ زبان پر لائے بغیر ایک لائٹ مشین گن سنبھالے لیٹا رہا۔ راتیں ہولناک ہو گئی تھیں۔ ہر آہٹ پر دشمن کے سپاہیوں کی پیش قدمی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ اندھیرے میں فائر کھول دیتے تھے۔ ۱۷ جون کی شام تک ان کے پاس ۱۲.۷ بور مشین گن کی صرف ۳۰۰ گولیاں اور سب مشین گن کا صرف ایک میگزین باقی بچا تھا۔ دو لائٹ مشین گنوں کے لیے ایک گولی بھی باقی نہ تھی۔

۱۶ جون کی رات کو گیارہ بار بردار پہنچے۔ وہ راشن اور ایمونیشن لے کر آئے تھے۔ زخمیوں کو اکٹھا کر کے واپس بھجوا دیا گیا اور نئے آنے والوں کو ان کی جگہ تعینات کر دیا گیا۔ یہ کارروائی بمشکل مکمل ہوئی تھی کہ دشمن کے توپخانے نے گولہ باری شروع کر دی جو کئی گھنٹے جاری رہی۔ نائک نور اور سپاہی عباس اس گولہ باری کی براہ راست زد میں آکر شہید ہو گئے۔ مہدی بنکر اور ۱۲.۷ بور کی مشین گن تباہ ہو گئی۔ آدھی رات کے بعد کا عمل ہو گا جب مشاہداتی چوکی سے ایک این سی او نے آکر بتایا کہ دشمن کے پیدل دستے مختلف تودوں کی آڑ لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ٹریگر کنٹرول بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن میجر ارشد نے اپنے نوجوانوں کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی کہ وہ ایمونیشن کو بڑی کفایت سے استعمال کریں۔ کوششیں رنگ لائیں اور وہ دشمن کی پیش قدمی روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ صبحدم دشمن کے پیدل دستے توپیا

ہو گئے لیکن توپخانے کی گولہ باری جاری رہی اور اس سے خاصا نقصان ہوا۔ دوپہر تک مین پوزیشن پر متعین چار سپاہی زخمی ہو چکے تھے۔ مشاہداتی چوکی پر موجود این سی او کو بھی ایک گولے کا ٹکڑا زخمی کر گیا تھا۔ شام چار بجے دشمن کے پیدل دستے پھر آگے بڑھنے کی تیاریاں کرتے نظر آئے۔ میجر ارشد اور ان کے ساتھیوں کے پاس ایمونیشن ختم ہو چلا تھا۔ صرف سب مشین گنوں کے چند میگزین باقی تھے جن سے بڑھتے ہوئے فوجیوں کو فاصلے سے زد میں لینا ممکن نہیں تھا۔ کسی طرف سے کسی کمک کی امید بھی نہیں تھی۔ میجر ارشد نے اپنے طور پر ایک فیصلہ کیا۔ انہوں نے تمام ہتھیار اکٹھے کر کے زخمیوں کے حوالے کیے اور انہیں واپس جانے کے لیے کہا۔ انہوں نے صرف دو سپاہی اور تین مشین گنیں اپنے پاس رکھیں۔ دشمن نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے ان پر فائر کیا لیکن اس فائرنگ سے انہیں محض ڈرایا جا سکتا تھا۔ سب مشین گنوں کی گولیاں بڑھتے ہوئے دشمن تک پہنچ نہیں پاتی تھیں۔ پانچ بجے شام میجر ارشد بھی ایک گولہ لگنے سے زخمی ہو کر گر پڑے۔ ان کے ساتھی انہیں کھینچ کر ایک تودے کے پیچھے لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے ساتھیوں نے تجویز دی کہ واپس چلا جائے۔ میجر ارشد نے اتفاق کیا۔ وہ ایک نالے میں اتر گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ تو دشمن کی سمت میں جا رہے ہیں۔ سمت درست کر کے دوبارہ چلنا شروع کیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ پچھلی چوکیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

۵-این ایل آئی نے دشمن کے پہلے حملے کا سامنا ۸ مئی کو کیا۔ پہلا حملہ مرزا چوکی پر ہوا اور اس کے بعد تمام چوکیوں پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ آغاز میں دشمن نے ریکی اور لڑاکا دستے بھیجے تاکہ مقبوضہ چوکیوں پر پاکستانی سپاہیوں کی تعداد اور قوت کا اندازہ ہو سکے۔ دشمن کی چلت پھرت روکنے کے لیے ۵-این ایل آئی نے بھی مختلف سمتوں میں جارحانہ گشت شروع کیا۔ کیپٹن اظہار حیدر کو ارشد اور خالد چوکیوں کے درمیان گشت کرنے کو کہا گیا۔ وہ پہلے درجے کی یخ زدگی اور بخار میں مبتلا تھے لیکن

انہوں نے اپنی صحت کی پرواہ نہ کی اور بیس جوانوں کو لے کر گشت پر روانہ ہو گئے۔ گشت کے دوران انہیں دشمن کی ایک کمپنی نظر آئی۔ انہوں نے گھات لگا کر ان پر حملہ کیا۔ پچاس کے قریب فوجی مارے گئے۔ باقی منتشر ہو کر مختلف سمتوں میں بھاگ نکلے۔ کوئی ہو گا کہ اس حال میں بھی جس کے اوسان خطا نہیں ہوئے اور اس نے اپنے ریر ہیڈ کوارٹر میں اس کی اطلاع کر دی۔ اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ کیپٹن اظہار ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ دشمن کے تازہ دم دستے آ پہنچے اور انہوں نے اظہار اور ان کے ساتھیوں کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش کی۔ کیپٹن اظہار نے ایک لائٹ مشین گن اور ۵۰۰ گولیاں اپنے پاس رکھیں اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ چپکے سے نکل جائیں جبکہ وہ دشمن کو الجھائے رکھیں گے۔ یہ اس سبق کی عملی مثال تھی جو پاکستان ملٹری اکیڈمی میں پہلے دن سے افسروں کو ازبر کرایا جاتا ہے کہ تمہارے جوانوں کی سلامتی اور فلاح و بہبود پہلے آتی ہے، تمہاری بعد میں۔ کیپٹن اظہار نے آخری گولی تک دشمن کو روکے رکھا یہاں تک کہ ان کے تمام ساتھی بحفاظت نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۲ جون کے بعد دشمن نے ۵- این ایل آئی کی تمام چوکیوں پر بھرپور حملے شروع کر دیے۔ یونٹ کے افراد لائن آف کنٹرول سے ۲۱ سے ۲۴ کلومیٹر دور تھے۔ کھانے پینے کی تمام اشیاء ختم ہو چکی تھیں۔ ایمونیشن ختم ہونے کو تھا اور کمک کی آمد کے سلسلے تمام تر کٹے ہوئے، وہاں ٹھہرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا چنانچہ انہیں بھی واپسی کا حکم دیا گیا۔ ۱۵ جون تک ۵۰ فیصد چوکیاں خالی کی جا چکی تھیں۔

۱۶ جون کو دشمن کے ایک جہاز نے ۵ این ایل آئی کے انتظامی مستقر ''بدر بیس'' پر بمباری کی۔ یہ مستقر، لائن آف کنٹرول سے ایک کلومیٹر آگے واقع تھا۔ اس بمباری نے سخت تباہی پھیلائی، پانچ افسر چھ جوان شہید اور کئی زخمی ہوئے۔ سارا ساز و سامان، اسلحہ بارود اور خوراک کے ذخائر تباہ ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی اگلی چوکیوں

میں ایمونیشن اور خوراک کی سخت قلت تھی لیکن اس کے بعد تو رسد کا سلسلہ بالکل ہی منقطع ہو گیا۔ پہلے پیچھے آنے والوں کی اس مستقر میں خاطر تواضع ہوتی تھی، اب یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ افسروں اور جوانوں کو کئی کئی دن کے فاقے کاٹنے پڑے۔ لیکن آفرین ہے ان پر کہ اس کے باوجود انہوں نے دشمن کے حملوں کے دوران کسی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ جوانمردی اور استقلال کے ساتھ اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے اور جب تک حکم نہیں ملا، اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔

۱۷ جون کو زبردست لڑائی کے بعد دشمن خاقان چوکی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم ۸- این ایل آئی کے میجر اعظم نے دوبارہ اسے دشمن کے قبضے سے چھڑا لیا۔ اس کی تفصیلات ہم ایک الگ باب میں بیان کریں گے۔

۵- این ایل آئی کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل تنویر ۳ جولائی کو زخمی ہونے کی وجہ سے پیچھے بلا لیے گئے۔ چار دنوں بعد ۷ جولائی کو لیفٹیننٹ کرنل نعیم ذکاء نے یونٹ کی کمان سنبھالی۔ وہ ایبٹ آباد کے قریب شنکیاری میں قائم جونیئر لیڈر شپ اکیڈمی میں تعینات تھے اور انہوں نے رضاکارانہ پیشکش کی تھی کہ انہیں شمالی علاقوں میں تعینات کیا جائے۔ ۷ جولائی کو انہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے سکردو سے ریاض بیس پہنچایا گیا جس کی بلندی ۱۵۵۰۰ فٹ تھی۔ اس سے اگلے روز وہ ''سیڈل'' میں تھے جو مزید دو ہزار فٹ بلند تھی۔ ان کے نائب کماندار اور ایڈ جوئنٹ حمزی غنڈ میں تھے۔ ان کے پاس صرف ۱۲۴ افراد تھے جو مختلف چوکیوں میں بکھرے اپنی جنگ آپ لڑ رہے تھے۔ یونٹ کو واپسی کا حکم دیا جا چکا تھا تو نئے کمانڈنگ آفیسر کا یہی کام تھا کہ وہ بحفاظت اپنے جوانوں اور ساز و سامان کی واپسی کا بندوبست کرے۔ اس اپریشن کی تکمیل میں انہیں دس دن لگے۔ ۱۷ جولائی کو سیکٹر ۳۳ ایف ایف کے حوالے کر دیا گیا۔ پورے اپریشن کے دوران ۵ این ایل آئی کے ۴۰ افراد شہادت سے ہمکنار ہوئے جبکہ ۱۲۷ افراد زخمی ہوئے۔ چھ افراد معذور ہو گئے اور تین افراد ٹانگ عنایت،

سپاہی حسن اور سپاہی شیر دشمن کے ہاتھوں قید ہوئے۔

۵-این ایل آئی کی شجاعت و بہادری کے اعتراف میں چار افراد کو ستارہ جرات دیا گیا۔ ان میں کمانڈنگ آفیسر تنویر احمد خان، کیپٹن اظہار حیدر شہید، نائب صوبیدار عاقل حسین شہید اور نائب صوبیدار محمد خاقان شہید شامل ہیں۔ چھ این سی اوز، حوالدار جاوید شہید، حوالدار کریم شاہ، نائک فیروز خان، نائک بلال شہید، نائک گلزار شفقت اور لانس نائک عبداللہ شہید تمغہ جرات سے نوازے گئے۔

۳۳ ایف ایف نے صرف ۵-این ایل آئی کا خالی کردہ علاقہ ہی نہیں سنبھالا بلکہ ۱۴ سندھ اور ۸ این ایل آئی کے خالی کردہ سیکٹروں کی ذمہ داری بھی انھیں سونپی گئی۔ خیال یہ تھا کہ چونکہ لائن آف کنٹرول کے آگے قائم کی جانے والی چوکیاں خالی کر دی گئی تھیں اور اپنے دستے اپنے علاقوں میں واپس آگئے تھے اس لیے شاید زیادہ لڑائی بھڑائی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا دشمن غصے سے بپھرا ہوا تھا اور اس کے توپخانے کی اندھا دھند گولہ باری اور جہازوں کی بمباری جاری تھی۔ جنگ بندی تک ۳۳ ایف ایف کے ۲۲ افراد شہید (جن میں لیفٹیننٹ فیصل ضیاء ستارہ جرات شامل تھے) اور ۴۳ افراد زخمی ہو چکے تھے۔

۲۴ جون کی صبح پونے سات بجے دشمن کے دو جہاز افق پر نمودار ہوئے اور انھوں نے ۶ این ایل آئی کی ایک چوکی پر لیزر گائیڈڈ میزائل گرائے جو عین چوکی کے اوپر آ کر گرے۔ خوش قسمتی سے چوکی کے افراد نماز فجر کی ادائیگی کے لیے چوکی سے ہٹ کر ایک تودے کے پیچھے گئے ہوئے تھے اور نماز کے بعد مختلف اوراد و وظائف میں مصروف تھے جب یہ فضائی حملہ ہوا۔ نماز کی برکت سے انھیں کوئی آنچ نہ آئی۔

۲۶ جون کو مجاہدین کی ایک ٹیم جو کوزیگی اور مشکو نالے کے سنگم پر گھات لگا کر دشمن پر حملہ کرنے گئی تھی، کامیاب حملے کے بعد واپس لوٹی۔ انھوں نے مشکو بواب کے رستے میں بارودی سرنگیں بچھائی تھیں اور خود گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے، دشمن کی ایک

گشتی پارٹی جو بارہ افراد پر مشتمل تھی، وہاں سے گزری تو انھوں نے ریموٹ کنٹرول سے سرنگیں اڑا دیں۔ تمام فوجی موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔

۲۶ جون کو ۱۲-این ایل آئی کے صوبیدار سکندر نے جو B-۱۲۸ پر تعینات تھے، سپاہی کریم، اجمل اور عثمان کو ساتھ لیا اور سفید نالے میں دشمن کی ایک چوکی کی طرف گئے۔ چار سپاہی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ صوبیدار سکندر کے حملے سے تین موقع پر دم توڑ گئے جبکہ چوتھا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

حوالدار لالک جان ۱۸ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ریکروٹ کی حیثیت سے این ایل آئی میں بھرتی ہوئے تھے۔ ابتدائی تربیت کی تکمیل پر انھیں ۱۲-این ایل آئی میں تعینات کیا گیا تھا۔ بھرتی کے وقت وہ چٹے ان پڑھ تھے۔ دستخط تک نہیں کر سکتے تھے۔ تنخواہ لینے کے لئے متعلقہ کاغذات پر انگوٹھا لگاتے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور اس کے لیے انھوں نے سخت محنت کی۔ تھوڑے دنوں بعد ہی نہ صرف انھیں پڑھنا لکھنا آ گیا بلکہ وہ ایک قابل اعتماد این سی او بن گئے۔ انھیں میس این سی او کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ آفیسر میس کا تمام حساب کتاب میس این سی او کے ذمے ہوتا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں انھیں حوالدار کے عہدے پر ترقی دی گئی اور ۲۳ اپریل ۱۹۹۳ء کو انھیں الفا کمپنی میں کمپنی حوالدار میجر مقرر کیا گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ دسمبر ۱۹۹۸ء میں ۱۲-این ایل آئی کی طرف سے جو پہلی پارٹی لائن آف کنٹرول کے پار ریکی کے لئے گئی، حوالدار لالک جان اس میں شامل تھے۔

۵ جولائی کو انھیں قادر چوکی پر تعینات کیا گیا جہاں اس وقت زبردست جھڑپیں جاری تھیں۔ بائیس افراد کے ساتھ مل کر انھوں نے دو دنوں میں سات حملے پسپا کیے۔ لالک جان ہمیشہ اگلے مورچوں میں موجود رہے اور تھوڑی دیر ستانے کے لیے بھی کبھی پیچھے نہیں آئے۔ ان کا سب سے زیادہ جراتمندانہ اقدام ۷ جولائی کو دیکھنے میں آیا۔ وہ مین پوزیشن سے آگے ایک سکرین پر تعینات تھے جب دشمن نے پوری

ایک بٹالین کے ساتھ ان پر بھرپور حملہ کیا۔ سکرین پر موجود سوائے تین افراد کے، سب شہید ہو گئے یا شدید زخمی۔ حوالدار لالک جان واحد شخص تھا جسے کوئی زخم نہ آیا تھا۔ انھوں نے اپنے دو زخمی ساتھیوں لانس نائیک محمد بشیر اور سپاہی تجمل سمیت مورچے کو سنبھالے رکھا۔ بڑھتے ہوئے دشمن کے سپاہیوں پر دستی بم پھینکنے کے لیے وہ ایک چٹان سے آگے جھکے تو مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ ان کے سینے پر لگی۔ اس کے بعد بھی چار گھنٹے تک وہ مورچے میں ڈٹے، فائرنگ کرتے رہے اور دشمن کو آگے نہیں آنے دیا۔ اس دوران ان کے دونوں ساتھی بھی شہید ہو گئے۔ اس کے بعد کی بات ہے کہ انتظامی مستقر سے سپاہی شاہین اور افتخار حسین ایمونیشن لے کر وہاں پہنچے۔ انھوں نے دیکھا کہ حوالدار لالک جان تن تنہا، زخموں سے نڈھال سب مشین گن سنبھالے بیٹھا ہے۔ اس پر غنودگی طاری تھی لیکن نظریں دشمن کی سمت اور انگلیاں ٹریگر پر جمی ہوئی تھیں۔ ان دو سپاہیوں نے انھیں پانی پلایا۔ وہ بولنے کے قابل ہوئے تو دونوں سپاہیوں کو واپس جانے کو کہا، چونکہ وہاں ٹھہرنا بے سود تھا۔

دونوں سپاہیوں نے پہلے تو واپس جانے سے انکار کر دیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب حوالدار لالک جان نے آخری ہچکی لی تو وہ لوٹ آئے۔ ان کی بہادری کے اعتراف میں انھیں بعد از مرگ نشان حیدر کا اعزاز عطا کیا گیا۔ انھوں نے ایک بیوی اور تین بچے سوگوار چھوڑے۔ تینوں بچے طارق عزیز، روبینہ بی بی، اور امینہ بی بی ان کی شہادت کے وقت دس سال سے کم عمر تھے۔

۱۲ -این ایل آئی کے سپاہی عرفان اللہ شمالی علاقوں میں تحصیل استور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں گوری کوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق ایک معزز گھرانے سے تھا۔ ان کے ماموں سعادت خان، استور کی یونین کونسل کے وائس چیرمین اور چچا شمالی علاقوں کے چیف جسٹس تھے۔ ان کے چھ بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ گوری کوٹ میں مڈل تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ این ایل آئی سنٹر بونجی

میں بھرتی ہو گئے۔ خوش طبیعت، ملنسار شخص تھا۔ جب گھر آتا سارے دوستوں رشتہ داروں سے ملتا۔ ان کے گھر کے قریب ہی کچھ لوگ بستے تھے جن کے تعلقات ان کے گھر والوں سے کشیدہ تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ گھر آئے تو پتہ چلا کہ ان کے ہاں ایک بچی بیمار ہے۔ وہ تمام کشیدگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، ان کے گھر جا پہنچے، بچی کو لے کر ڈاکٹر کو دکھایا اور دوائیں خرید کر دیں۔ بچی تو جانبر نہ ہو سکی لیکن ان کے حسن سلوک کا چرچا گھر گھر پھیل گیا۔ بچی کی تجہیز و تکفین کا انتظام سپاہی عرفان اللہ نے کیا۔

آخری مرتبہ ۱۹۹۸ء میں وہ چھٹی پر گھر آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ آخری عشرہ اپنے چچا زاد بھائی طارق جاوید کے ساتھ اعتکاف میں گزارا۔ وہ خود بھی اپنی شہادت کے لیے دعا کرتے اور اپنے دوستوں سے بھی درخواست کرتے کہ وہ ان کے لیے شہادت کی دعا کریں۔ انھیں کیپٹن کرنل شیر کے ساتھ مشکو نالے میں دشمن پر حملے کے دوران شہادت نصیب ہوئی۔ اس کا تفصیلی ذکر ایک الگ باب میں آئے گا۔

۱۲ جولائی کو ۱۲ -این ایل آئی کو حکم ملا کہ وہ تمام چوکیاں خالی کر کے زکریا بیس میں واپس آ جائیں۔ اسی صبح دشمن کے جہازوں نے زکریا بیس پر بمباری کی۔ ۳۰ ایس پی رجمنٹ کے کیپٹن ساجد اور نائک انیس افضل موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ خوراک کے ذخیرے، اسلحہ بارود، سب کچھ تباہ ہو گیا۔ چوکیوں سے واپسی میں جوانوں کو چار دن لگے۔ تھکے ماندے زخموں سے چور، وہ اس امید پر زکریا بیس پہنچے کہ کھانے پینے کو کچھ میسر آئے گا اور گھڑی دو گھڑی آرام کریں گے۔ لیکن یہاں بھی اداسی بال کھولے سو رہی تھی۔ تباہی کا ہولناک منظر۔ واپسی کے سفر میں بھی کئی افراد دو دو تین تین دن بھوکے رہے۔ سیکٹر ۱۹ -ایف ایف کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۲- این ایل آئی گلتری پہنچ گئی۔ اپریشن کے دوران ۱۶ افسر، ۳ جونیئر کمیشنڈ آفیسر اور ۱۸۶ افراد نے جام شہادت نوش کیا ۱۶۵ افراد زخمی ہوئے جن میں سے چھ افسروں کی حالت نازک تھی۔

جب علاقے میں موجود جوانوں کی جانیں بچانی بھی مشکل ہو گئیں تو دفاعی مقاصد کے لیے مزید فوجی قوت کی ضرورت پڑی۔ ۱-آزاد کشمیر بریگیڈ، ۱۲ ڈویژن کے ماتحت تھا۔ بریگیڈ کو فوری طور پر شمالی علاقوں میں پہنچنے کا حکم ملا۔ ۱۰-این ایل آئی، اس بریگیڈ کی ماتحتی میں آزاد کشمیر میں پانڈو پر تعینات تھی۔ انھیں شمالی علاقوں کی طرف کوچ کا حکم ملا۔ وہ ۲۸ جون کو گلتری پہنچے۔ ان کے کچھ دستے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ۱۲ این ایل آئی کے ان علاقوں میں پہنچائے گئے جو وہ خالی کر آئے تھے۔ ایک کمپنی نے کیپٹن شیر والا سیکٹر سنبھالا۔

۲۸ جون سے ۱۵ جولائی تک ۱۰ این ایل آئی کے چھ افراد شہید ہوئے جن میں ایک افسر بھی شامل تھا، کیپٹن عامر علی۔ ان کا تعلق ایبٹ آباد سے تھا۔ ان کا اصلی یونٹ ۴۰ لانسر تھا جو نشان حیدر حاصل کرنے والے سوار محمد حسین شہید کی وجہ سے مشہور ہے۔ کیپٹن عامر پر جوش طبیعت کا مالک تھا، شہادت کا تمنائی۔ آخری بار جب وہ چھٹی پر گھر آئے تو والدہ سے درخواست کی کہ وہ اس کی شہادت کے لیے دعا کریں۔ محاذ پر وہ بارودی سرنگیں بچھا رہے تھے جب دشمن کے مارٹر کا ایک گولہ عین ان کے قریب آ کر گرا۔ اس گولے سے بارودی سرنگیں دھماکے سے اڑ گئیں اور کیپٹن عامر بری طرح زخمی ہو گئے۔ ان کی ٹانگیں کٹ گئیں اور پورا جسم آگ سے جھلس گیا۔ انھیں پیچھے منتقل کیا جا رہا تھا جب ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

۱۱ سندھ، ۷ آزاد کشمیر بریگیڈ کا حصہ تھی اور جڑی کس پر تعینات۔ اس بریگیڈ کو بھی شمالی علاقوں کی طرف کوچ کا حکم ملا۔ ۱۱ سندھ نے ۳ جولائی کو سفر شروع کیا اور ۵ جولائی کو وہ جگلوٹ پہنچ گئے۔ دوسرے دن انھوں نے درہ برزل عبور کیا۔ ان کی دو کمپنیاں کامری سیکٹر میں متعین کی گئیں اور باقی دو نے داؤ سیکٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۲۴ سندھ جو ڈومیل سیکٹر میں تعینات تھی، اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ دشمن دوسرے سیکٹروں میں الجھا رہا اور جون کے آخر تک ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ جولائی ۱۹۹۹ء

کے پہلے ہفتے میں ان کی "باری" آئی۔ پہلے تو دشمن نے توپخانے سے زبردست بمباری کی اور پھر پیدل دستوں نے لہر در لہر پیش قدمی شروع کی۔ وہ دو بنکروں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی علاقے میں ذرا ہٹ کر ایک اور بنکر تھا جو الگ تھلگ تھا۔ اس میں موجود دو جوان اپنے مورچے میں ڈٹے رہے اور انھوں نے دشمن کو قریب نہیں آنے دیا۔ تین دن تک وہ بھوکے رہے اور ان تک رسد نہ پہنچ پائی۔ چوتھے دن کا ذکر ہے سینئر جے سی او صوبیدار رمز گل نے چند افراد ساتھ لئے اور بند خوراک کے ڈبے اور پانی کی بوتلیں لے کر ان کی سمت چلے۔ دشمن کی بھاری گولہ باری کے باوجود وہ لچپال بیس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں سے آگے سفر کے دوران وہ ایک گولے سے زخمی ہو کر گر پڑے۔ ان کے ساتھیوں نے ایک بوتل کھول کر انھیں پانی پلانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے پانی پینے سے انکار کر دیا، بولے "جانے کب سے میرے جوان پیاسے مر رہے ہیں میں پانی کیسے پی لوں"۔ انھوں نے بوتل کا ڈھکنا لگایا اور رینگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ وہ مطلوبہ بنکر سے چند قدم کے فاصلے پر تھے جب دشمن کا ایک گولہ عین ان کے اوپر گرا اور وہ موقع ہی پر شہید ہو گئے۔

۹ جولائی کی صبح ۴ بجکر دس منٹ پر کیپٹن علی ذوالقرنین نے پانچ جوان اپنے ساتھ لیے اور بنکر کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے ان دو مورچوں کو خالی کرانا ضروری ہے جن پر دشمن نے قبضہ کر لیا تھا اور جہاں سے وہ براہ راست ان کوششوں کو دیکھ سکتے تھے جو تیسرے بنکر تک رسائی کے لیے کی جا رہی تھیں۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے مقبوضہ بنکروں کو خالی کروانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن اس دوران کیپٹن علی اور نائک رضا سخت زخمی ہو گئے۔ گولوں کے ٹکڑے ان کے سروں میں آ کر لگے تھے۔ سپاہی شیر، فیصل اور خیبران دونوں کو لے کر واپس گئے جبکہ دو سندھی جوانوں، غلام علی اور لیاقت کو پیچھے چھوڑا گیا کہ وہ ان بنکروں میں رہ کر دشمن کی پیش

قدمی روکے رکھیں تا کہ پیچھے سے ان تک اور تیسرے بنکر تک کمک پہنچائی جا سکے۔ ان دونوں سندھی جوانوں نے زبردست شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ وہ بغیر کچھ کھائے پیے ۳۶ گھنٹوں تک اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے اور دشمن کو قریب نہ پھٹکنے دیا۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ ان کا تعلق صحرائے سندھ سے تھا اور وہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر لڑ رہے تھے جہاں سانس لینا بھی دشوار ہوتا ہے۔ بالآخر ایک افسر میجر مشتاق ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب میجر مشتاق ان تک پہنچے تو ان کے پاس صرف آٹھ گولیاں بچی تھیں۔ میجر مشتاق کے پہنچنے پر انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کھانے پینے کو کچھ لائے ہیں یا نہیں، ان کا سوال تھا ''سر! ایمونیشن لائے ہیں''۔ وہ نہ صرف ایمونیشن لائے تھے بلکہ بند ڈبوں میں کھانے پینے کا سامان بھی۔ اس وقت تک چونکہ دشمن کو براہ راست مشاہدے کی سہولت میسر نہیں تھی اس لیے تیسرے بنکر تک رسائی آسان تھی۔ ان تک کھانے پینے کا سامان پہنچایا گیا اور کچھ دیر بعد انھیں وہاں سے واپس بلا لیا گیا۔

۱۱-این ایل آئی کامری میں تعینات تھی۔ ۱۷ جون کی رات ۹ بجے اطلاع ملی کہ بنیال سیکٹر میں کئی چوکیوں پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے۔ انھیں فوری طور پر بنیال پہنچنے کا حکم ملا۔ نائب کماندار میجر کفیل احمد نے ۱۷ افراد ساتھ لیے اور بنیال کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک حادثے میں چار افراد زخمی ہو گئے۔ ۲۸ جون تک پوری یونٹ بنیال پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے لڑاکا گشتی دستوں کے ذریعے دشمن کی نقل و حرکت محدود کر دی اور کئی حملے پسپا کیے۔ ان کے ۲۷ افراد جن میں دو افسر شامل تھے شہید ہوئے اور ۵۶ زخمی۔

۴-این ایل آئی کی کمپنیاں مختلف علاقوں میں برسرِ پیکار تھیں۔ ایک کمپنی ۳۲۳ بریگیڈ کے ماتحت تھی ایک ۶۲ بریگیڈ کے ساتھ حمزی غنڈ میں تھی باقی دو کمپنیاں بھی اسی طرح بٹی ہوئی تھیں۔ اس طرح اس بٹالین کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پورے

محاذ پر جنگ میں حصہ لیا۔ پہلے اسے لیفٹیننٹ کرنل شاہد کمان کر رہے تھے۔ پروموشن پر ان کی رخصتی کے بعد لیفٹیننٹ کرنل عادل جہاں نے یونٹ کی کمان سنبھالی۔ وہ مئی ۱۹۹۶ء سے ستمبر ۱۹۹۸ء تک پیون سیکٹر میں ۷-این ایل آئی کمان کر چکے تھے۔ سوا تین سال کمان کے بعد ان کی پوسٹنگ ۴ کور کے ہیڈ کوارٹر میں بطور سٹاف آفیسر ہوئی تھی۔ کارگل کی خبریں ملیں تو انھوں نے رضا کارانہ طور پر پیشکش کی کہ انھیں دوبارہ شمالی علاقوں میں کوئی ذمہ داری دے دی جائے۔ ملٹری سیکرٹری نے ان کی بات مانتے ہوئے انھیں ۴-این ایل آئی کی کمان سونپ دی۔ ان کے ۹ افراد جن میں ایک افسر میجر عباس شامل تھے، شہید جبکہ ۱۲۱ زخمی ہوئے۔ دو افراد لاپتہ ہوئے جن کے بارے میں گمان ہے کہ وہ زندہ ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل عادل جہاں عالمگیرین ہیں یعنی ملٹری کالج جہلم کے پڑھے ہوئے۔ شمالی علاقوں میں اور بھی عالمگیرین تھے جو مختلف پلٹن کمان کر رہے تھے۔ پیون سیکٹر میں ۳-این ایل آئی کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل اعجاز احمد، کامری سیکٹر میں ۱۱-این ایل آئی کے کمانڈنگ آفیسر ثقلین افضل، گلتری سیکٹر میں ۱۲-این ایل آئی کے کمانڈنگ آفیسر خالد نذیر اور شقمہ سیکٹر میں ۱۳ این ایل آئی کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل نور حسین۔ ۲۸ بریگیڈ بھی اضافی بریگیڈ تھا جو بعد میں منگوایا گیا۔ اس بریگیڈ نے یکم جولائی کو کرکیٹ نالے تک کا علاقہ سنبھالا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۳-این ایل آئی کو شقمہ سیکٹر میں تعینات کیا گیا تھا۔ کیپٹن ظفر علی جن کا تعلق ۱۴ لانسرز سے تھا، ۱۷ اپریل ۱۹۹۹ء کو ۱۳-این ایل آئی پہنچے، انھوں نے پیشکش کی کہ انھیں سب سے اگلے مورچوں پر بھیجا جائے جہاں تباہ کن سردی کی شدت کی وجہ سے ہاتھوں، پیروں یا انگلیوں سے محروم ہونے بلکہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خدشہ بھی تھا لیکن انھوں نے ذرہ برابر پرواہ نہیں کی اور آگے جانے پر اصرار کیا۔ انھیں ۷ مئی کو آگے بھیج دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد انھیں چھ افراد کا ایک

گشتی دستہ اپنی چوکی کی طرف آتا دکھائی دیا جن کے ساتھ ایک افسر بھی تھا۔ کیپٹن ظفر نے گھات لگا کر ان پر حملہ کیا اور سب کو ہلاک کر دیا۔ اس کے فوراً بعد دشمن کے توپخانے نے گھنٹوں ان کی چوکی پر گولہ باری کی لیکن پیدل دستوں میں سے کسی کو پیش قدمی کی جرات نہ ہوئی۔ ۱۵ اور ۱۶ مئی کی رات کو دشمن کے پیدل دستوں نے ان کی چوکی پر بھرپور حملہ کیا۔ کیپٹن ظفر نے اپنے جوانوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ فائر ڈسپلن کی پابندی کریں اور جب تک دشمن بالکل قریب نہ آجائے فائر نہ کھولیں۔ یہ پابندی کام آئی۔ فائر اس وقت کھولا گیا جب دشمن کے سپاہی بیس میٹر کے فاصلے پر تھے۔ ان کے بے شمار فوجی مارے گئے اور باقی بھاگ نکلے۔ وہ اپنی دو مشین گنیں بھی پیچھے چھوڑ گئے جو کیپٹن ظفر نے قبضے میں لے لیں۔ اس کے بعد بھی ان پر کئی بار حملے ہوئے لیکن ظفر اور ان کے ساتھی اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے اور دشمن کے حملے پسپا کرتے رہے۔

بار بار کوششوں کے باوجود جب کیپٹن ظفر کی چوکی پر قبضہ نہ کیا جا سکا تو دشمن نے ایک نئی چال اختیار کی۔ ۵ اور ۶ جون کی درمیانی شب کیپٹن ظفر کے قریب واقع ایک اور چوکی پر حملہ کیا جسے ایک افسر سعید احمد خان کمان کر رہے تھے۔ دشمن کا توپخانہ کیپٹن ظفر کی چوکی پر گولے برسا رہا تھا اور پیدل دستے کیپٹن سعید کی چوکی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ظفر کی چوکی کے لوگ سر نہ اٹھا سکیں اور کیپٹن سعید کی چوکی سے نبٹنے کے بعد اس چوکی کا رخ کیا جائے۔ کیپٹن ظفر کو دشمن کی گولہ باری روک نہ سکی اور انھوں نے کیپٹن سعید کی چوکی کی طرف بڑھتے ہوئے دستوں پر بھی موثر فائرنگ کی۔ دو اطراف سے فائرنگ کی زد میں آنے کے بعد دشمن کے لیے راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

۱۳ این ایل آئی کے افراد کو ۳ ستارہ جرات، ۲ تمغہ جرات، ۵ تمغہ بسالت، ۱۵ تعریفی اسناد اور ۲ امتیازی سندیں عطا ہوئیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علاقے میں جنگ کتنی شدید تھی اور ان کے افراد کتنی بے جگری سے لڑے۔

توپخانے کی کارکردگی

جیسا کہ ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ شمالی علاقوں میں پاکستان کو بھارتی توپخانے پر عددی برتری حاصل نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ایف سی این اے کمانڈر نے مزید توپوں کا مطالبہ کیے بغیر لائن آف کنٹرول کے پار اپریشن کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی کہ ان کے پاس جو توپیں موجود تھیں اور جن میں اکثریت فیلڈ گنوں کی تھی، ان دستوں کی کوئی مدد نہ کر سکیں گی جو بہت آگے نکل جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لائن آف کنٹرول کے پار جانے والے یونٹوں کو یہ بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ کہاں تک جا سکتے ہیں اور انہیں کہاں جا کر رکنا ہے۔ جب ایک یونٹ کے افسروں نے رپورٹ دی کہ وہ کارگل دراس روڈ تک پہنچ گئے ہیں تو ان کی بات پر یقین نہیں کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی پوزیشن کی ٹھیک طرح جانچ پڑتال کریں، اس علاقے میں مذکورہ سڑک کے علاوہ کوئی اور سڑک تھی ہی نہیں، انھوں نے کیا جانچ پڑتال کرنی تھی۔ اس سے وقتی طور پر تو بالا ہیڈ کوارٹر میں خوشی کے ترانے بجائے گئے لیکن جب بھارتی توپخانے نے تابڑ توڑ گولہ باری شروع کی اور اگلی چوکیوں پر متعین دستوں نے دشمن کے توپخانے کا توڑ کرنے اور ان کے پیدل دستوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے اپنے توپخانے کا جوابی فائر مانگا تو اپنے توپخانے میں

اتنی سکت ہی نہیں تھی۔ ان کے مطالبوں کے جواب میں خاموشی اختیار کی جاتی یا انہیں طفل تسلیاں دے کر چپ کر دیا جاتا۔ جب صورت حال قابو سے نکلتی نظر آئی تو توپخانے کی ایسی نئی یونٹوں کا مطالبہ کیا گیا جن کے پاس بھاری یا میڈیم بور کی توپیں موجود ہوں۔

ایسی ہی ایک یونٹ ۶۳ میڈیم رجمنٹ تھی جو ۱۹۹۹ء کے آغاز میں ۲۳ ڈویژن کے ماتحت جہلم میں تعینات تھی۔ اس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل محمد یونس برولا کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۸ جون کو انہیں حکم ملا کہ وہ فوری طور پر شمالی علاقوں کی طرف کوچ کریں۔ انہوں نے جلدی جلدی تیاریاں کیں اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ ۲۱ جون کو وہ جگلوٹ پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے انہیں پہلے سکردو کی طرف کوچ کا حکم ملا لیکن پھر کہا گیا کہ وہ اپنی توپوں کو حصوں پرزوں میں کھول دیں اور انہیں اس طرح تیار کریں کہ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اگلے علاقوں میں پہنچائی جا سکیں۔ انھوں نے تیزی سے یہ کام مکمل کر کے ایف سی این اے ہیڈکوارٹر کو اطلاع دی کہ احکامات کے مطابق کام مکمل ہو گیا ہے۔ ایف سی این اے کمانڈر اتنی جلدی احکامات کی تکمیل پر حیران تھے۔ انہیں یقین نہیں آیا اور وہ خود کھلی ہوئی توپوں کا معائنہ کرنے آئے۔ خوشگوار حیرت کے ساتھ انہوں نے یونٹ کے لیے دس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا۔ انہوں نے ہدایت کی کہ چند افراد کو پیچھے چھوڑ دیا جائے اور باقی یونٹ فارن شاٹ کی طرف روانہ ہو جائیں۔ ۲۴ جون کو ان کی ایڈوانس پارٹی آگے روانہ ہو گئی اور ۲۵، ۲۶ جون کی درمیانی رات وہ دنباباؤ پہنچ گئے۔ وہ فارن شاٹ پہنچے ہی تھے کہ ہیلی کاپٹروں نے ان کی توپیں بھی وہاں پہنچا دیں۔ وہ انہیں جوڑنے میں مصروف ہو گئے اور دو دنوں کے اندر اندر فائرنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ یکم جولائی کو انہوں نے پہلا گولہ فائر کیا۔

۳ جولائی کو انہیں آگاہ کیا گیا کہ دشمن تولولنگ کی آگے والی چوکیوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے، وہ جوابی کارروائی کے لیے تیار رہیں۔ ۶۳ رجمنٹ نے

اس دن ۱۶۰ گولے فائر کیے۔ اگلے دن انہوں نے ٹائیگر ہلز کے علاقے میں دشمن کا حملہ پسپا کیا۔ اس کے بعد ان کا ایک سیکشن گلتری منتقل کر دیا گیا۔ باقی توپیں فارن شاٹ میں موجود رہیں اور اگلی چوکیوں کو فائرنگ مہیا کرتی رہیں۔ این ایل آئی کے کچھ دستے کارگل دراس روڈ کے بالکل قریب پہنچے ہوئے تھے، یہ سڑک فارن شاٹ سے ۲۶ کلومیٹر دور تھی۔

ان توپوں کی زیادہ سے زیادہ مار ۲۷۴۰۰ میٹر تھی۔ سپیشل فیوز کے استعمال سے گولوں کی مسافت ۳۰ کلومیٹر تک بڑھائی جا سکتی تھی۔ ان توپوں نے کارگل دراس روڈ پر دشمن کی نقل و حرکت محدود تو کی لیکن ان کی گولہ باری صرف دن کے وقت موثر ہوتی تھی جب اگلی مشاہداتی چوکیوں پر بیٹھے او پی، توپچیوں کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں دشمن کی نقل و حرکت جاری رہتی تھی۔

یہ تو تھی توپخانے کی ایک یونٹ کی بات۔ یونٹ میں توپ تو اہم ہوتی ہے لیکن اہم تر وہ بندہ ہوتا ہے جو توپ چلاتا ہے۔ تو آیئے ایک توپچی کی کہانی سنیں جس نے علاقے میں اہم کردار ادا کیا اور دشمن کے ایک طیارے کو مار گرایا۔

کیپٹن وحید الزماں ایک توپچی تھا۔ اس نے ۲۲ اپریل ۱۹۹۹ء کو ۹۷۴ انڈی پنڈنٹ میزائل بیٹری کے ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کی۔ اس بیٹری میں ۱۷۵ افراد تھے جن کی کمان ایک لیفٹیننٹ کرنل کے ہاتھ تھی۔ اس کے تین ٹروپس تھے اور ہر ٹروپ کی قیادت ایک کیپٹن کے ہاتھ میں تھی۔ تینوں ٹروپس مختلف یونٹوں کے ساتھ منسلک تھے۔ کیپٹن محمد فہیم ٹیپو، دو ٹروپس کو لے کر حزی غنڈ چلے گئے تھے۔ کیپٹن وحید الزماں موسم کے ساتھ تال میل کرتے مختلف جگہوں پر رکتے ۱۸ مئی ۱۹۹۹ء کو بدر مستقر پہنچے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے یہ مستقر ۵- این ایل آئی نے قائم کیا تھا۔ کیپٹن وحید نے ۵ این ایل آئی کے کمانڈنگ آفیسر، لیفٹیننٹ کرنل تنویر سے ملاقات کی جنہوں نے ہدایت کی کہ وہ چار دن بدر مستقر میں آرام کرنے کے بعد عاقل چوکی کی کمان سنبھالیں۔ توپچی ہونے کے ناطے کسی چوکی کی کمان ان کی ذمہ داری نہیں تھی لیکن افرادی قوت

کی قلت کے پیش نظر انہوں نے بلا چون و چرا، یہ ذمہ داری بھی سنبھال لی۔ فضاؤں کو تاکتے رہنا اور انہیں دشمن کے طیاروں سے محفوظ رکھنا ان کی بنیادی ذمہ داری تھی۔

۲۷ مئی کو صبح منہ اندھیرے بالا ہیڈ کوارٹر سے انہیں وارننگ ملی کہ دشمن کے طیارے سرینگر ایر پورٹ سے اڑنے والے ہیں، وہ ہوشیار رہیں۔ ان کی امکانی منزل کارگل دراس روڈ ہی ہو سکتی تھی۔ کیپٹن وحید اور ان کے ساتھی پوری مستعدی سے اپنی پوزیشنوں پر جمے رہے۔ وہ نماز فجر بھی ادا نہ کر سکے کہ اس طرح کی صورت حال میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ یا تو آپ جہاز گرا لیتے ہیں یا وہ دندناتے ہوئے تباہی پھیلا کر رخصت ہو جاتا ہے۔ طیارے ۶.۳۰ پر نمودار ہوئے۔ ان کی پرواز اونچی تھی اور وہ کیپٹن وحید کے دستے اور ان کی توپوں کی دسترس سے باہر تھے۔ وہ پورے علاقے پر دو چار چکر لگانے کے بعد بغیر کسی کارروائی کے واپس چلے گئے۔ ساڑھے دس بجے انہیں پھر وارننگ ملی کہ کچھ اور طیارے سرینگر ایر پورٹ سے اڑنے والے ہیں۔ اس مرتبہ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد پانچ طیارے نمودار ہوئے۔ نیچے پرواز کرتے ہوئے ان طیاروں نے غوطے لگاتے ہوئے مختلف چوکیوں پر بم گرانے شروع کیے۔ وحید اور اس کے ساتھی اس موقع کی تلاش میں تھے۔ کیپٹن وحید خود حوالدار بشارت کے ساتھ ایک سنگر میزائل سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک طیارے کا نشانہ لیا اور میزائل داغ دیا۔ یہ ٹھیک نشانے پر لگا۔ دشمن کے اس مگ ۲۱ میں آگ لگ گئی اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آ گرا۔ پائلٹ نے بر وقت چھلانگ لگا دی اور پیراشوٹ کی مدد سے وہ بحفاظت زمین پر اتر آیا۔ کیپٹن وحید کے دستے سے یہ پائلٹ، جس کا نام بعد میں معلوم ہوا کہ اسکواڈرن لیڈر راجے آہوجا تھا، پانچ چھ کلو میٹر دور اترا تھا۔ خیبر رائفل کے کچھ سکاؤٹس آس پاس موجود تھے۔ وہ پائلٹ کی طرف دوڑے۔ گرفتاری کے خوف سے سکواڈرن لیڈر راجے اہوجا نے خودکشی کو ترجیح دی اور اپنے پستول سے خود کو گولی مار لی۔ کیپٹن وحید کے دوسرے ساتھی بھی ایک مگ ۲۷

طیارے کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ شعلوں میں لپٹا یہ طیارہ واپس جاتے ہوئے کافی دور جا گرا۔

کیپٹن وحید دو مہینوں تک اگلے مورچوں پر فرائض انجام دیتے رہے۔ تین جولائی کو وہ دشمن کے ایک طیارے کی گولیوں سے زخمی ہوئے۔ انہیں بدر مستقر منتقل کر دیا گیا جہاں اور زخمی افسر اور جوان بھی پیچھے جانے کے لیے جمع تھے۔ وہ باہم بیٹھتے تو دل کے پھپھولے پھوڑتے کہ وہ ملک کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھے لڑ رہے ہیں لیکن حکومت ان کی موجودگی تک کا ذکر نہیں کر رہی۔ تمام کارروائیاں مجاہدین کے کھاتے میں ڈالی جا رہی ہیں۔ مجاہدین بھی بلا شبہ علاقے میں موجود تھے لیکن مین اپریشن تو ناردرن لائٹ انفنٹری کے دستے ہی انجام دے رہے تھے۔

اور اب ایک اور گنر کی کہانی جو ایک بھارتی افسر لیفٹیننٹ کرنل سنکرشن ٹھاکرنے وادی مشکوہ میں لکھی اور افسر کی میت کو واپس کرتے ہوئے پاکستانی یونٹ کے حوالے کی۔

''یہ ایک ایسے فرد کی شخصیت کی جھلکیاں ہیں جسے ہم ''دشمن'' کے ناپسندیدہ نام سے پکارتے ہیں، پاکستانی فوج کی ۱۶۵ مارٹر رجمنٹ کا کیپٹن امتیاز ملک۔

کیپٹن امتیاز ملک ۷ جولائی کو پوائنٹ ۴۸۷۵ کی شدید جھڑپ میں جان ہار گیا۔ جہاں وہ یہ جانتا تھا کہ لڑتے کیسے ہیں، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ محبت کیسے کرتے ہیں۔ اس کے سینے کی جیب سے ایک خط برآمد ہوا جو اس کی بیوی ثمینہ نے اسے لکھا تھا۔ یہ نیلے رنگ کا ایک مڑا تڑا کاغذ تھا جس پر کیپٹن امتیاز کے خون کے دھبے تھے۔ لفافے کی مہروں سے پتہ چلتا ہے کہ اسے ثمینہ نے ۱۴ جون کو اسلام آباد میں سپرد ڈاک کیا تھا۔ شاید یہ آخری خط تھا جو کیپٹن امتیاز کو لکھا گیا۔ کیپٹن امتیاز نے جو کاغذات آخری وقت تک سنبھالے رکھے ان میں اس کی بیوی کے دو اور سندیسے بھی تھے، ویسے ہی جیسے نوجوان عاشق ایک دوسرے کو لکھا کرتے ہیں۔ ان خطوں کے مندرجات کا انکشاف مرنے والے کی رازداری کا افشا اور اس کی بیوہ کے غم میں

اضافے کا سبب ہو گا۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ کیپٹن امتیاز ایسا شخص تھا جسے اس کے چاہنے والے بہت چاہتے تھے اور وہ بھی اپنے چاہنے والوں سے اتنا ہی پیار کرتا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو بھلا وہ اپنی بیوی کے خط میدان جنگ میں بھی سینے سے کیوں لگائے رکھتا۔

انفنٹری کے ان دستوں کے نزدیک جنہوں نے کیپٹن امتیاز کی ذاتی اشیاء قبضے میں لی تھیں، یہ خط لمحاتی خوشی اور تضحیک کا نشانہ تھے۔ ایک فوجی نے پوائنٹ ۴۸۷۵ سے سمیٹی جانے والی اشیاء اگلے مورچوں کے ایک خیمے میں پھیلاتے ہوئے کہا، یہ شخص شاید خود کو رومیو سمجھتا تھا کہ محاذ جنگ پر بھی اسے کوئی فکر تھی تو ان محبت ناموں کی"۔

یہ فوجی پوائنٹ ۴۸۷۵ پر زبردست جنگ سے لوٹے تھے، کیپٹن امتیاز پر پھبتیاں کس کر دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ امتیاز اور اس کے ساتھیوں نے بھارتی فوجیوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ انہوں نے بہت سے بھارتی فوجیوں کو زندگی سے محروم کیا، اور کتنے ہی افراد زخمی کیے تھے، تو ظاہر ہے کہ بھارتی فوجیوں کی نظروں میں کیپٹن امتیاز کے لیے کہ وہ پاکستانی فوج کی ایک پلاٹون کا کمانڈر تھا، اور کیا احساسات ہو سکتے تھے۔ وہ مر چکا تھا۔ اب اس کے خلاف تو کچھ ہو نہیں سکتا تھا لیکن اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں کا مذاق تو اڑایا جا سکتا تھا۔ تاہم ان کے افسر نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا، "وہ بھی ہماری طرح ایک انسان تھا، ایک انسان اور فوجی جو احکامات کا پابند تھا۔ وہ بھی کسی خاندان کا فرد تھا۔ کسی کا بیٹا، کسی کا شوہر۔ ہم بھی تو گھر سے آئے ہوئے خطوں کو اسی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں"۔

افسر کے ہاتھ میں ایک خط تھا جو پاکستانی فوج کے کسی سینئر افسر نے کیپٹن امتیاز کو آرٹلری کے کسی سپیشل کورس کے لئے منتخب ہونے پر مبارک دیتے ہوئے لکھا تھا۔ شفقت بھرے اس خط میں کیپٹن امتیاز کی بھرپور تعریف کی گئی تھی۔ اس خط کے مندرجات سن کر ایک فوجی نے تبصرہ کیا، "ان کے سینئر بھی اسی طرح جونیئر افسروں کو خط لکھتے ہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے"۔ خیمے میں موجود سب لوگ ہنس دیے۔

ایک اور فوجی بولا، "میں نے جب آرٹلری سکول میں تربیت مکمل کی تھی تو مجھے بھی میرے استاد نے اسی طرح کا خط لکھا تھا"۔

خیمے کے فرش پر وہ تمام اشیاء ترتیب سے سجا دی گئی تھیں جو پاکستانی بنکر سے اکٹھی کی گئی تھیں۔ ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کشمیر کے بالائی علاقوں میں پاکستان کس حد تک جارحیت میں ملوث ہے۔ ان میں طویل فاصلے تک پیغام رسانی والے دو فیلڈ ٹرانسمیٹر تھے، درجن بھر فوجی شناختی کارڈ تھے جن میں ناردرن لائٹ انفنٹری کے یونٹ نمبر اور فوجیوں کے عہدے لکھے ہوئے تھے، گیس ماسک تھے، کیمیاوی ہتھیاروں سے بچنے کے فلٹر، رنگین فلم کا ایک رول، اگلے مورچوں کے لیے راشن سپلائی کا ایک رجسٹر اور ایک البم جس میں پاکستانی فوجیوں کے ایک دوسرے کے ساتھ اور اہل خانہ کے ساتھ گروپ فوٹو چسپاں تھے۔

پاکستانی بنکر سے حاصل کردہ ان اشیاء میں اہم ترین چیز ایک فائل تھی جس میں دراس سیکٹر میں بھارتی توپخانے اور پیدل دستوں کی پوزیشنیں بڑی باریک بینی سے لکھی ہوئی تھیں، یہ تفصیلات دیکھ کر ایک افسر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنی توپوں کی جگہیں تبدیل کر دیں ہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ پاکستانی توپوں کے گولے ہمارے اتنے نزدیک کیوں اور کیسے گرتے ہیں۔ اب مجھے سمجھ آئی"۔ وہ بولا۔

بھارتی فوجیوں کے قبضے میں آنے والی اشیاء میں کیپٹن امتیاز کی ایک چیک بک بھی شامل تھی جس میں کئی چیک تھے، جنہیں امتیاز کو استعمال کرنے کا موقع نہ ملا۔ اس جنگ میں وہ خود اپنی زندگی پر اوور ڈرافٹ لکھ گیا۔

اور اب مندرج ہیں اس گولہ باری کی تفصیلات جو ۱۹۹۹ء میں دونوں جانب سے کی گئی۔ ان گولوں کی تعداد جو مختلف مہینوں میں مختلف توپوں سے فائر کیے گئے۔

مہینہ	فیلڈ گن	مارٹر	میڈیم گنز ۱۳۰ ایم ایم	۵.۵	چار دہانوں والا راکٹ لانچر	ایک دہانے والا راکٹ لانچر
جنوری	۵۳۹	۳۴۴	۷۵۸-	۸۴		
فروری	۳۹۶	۴۹۶	۶۷۶-	۱۴۴	۱۲	
مارچ	۵۱۱	۷۴۰	۴۴۱-	۱۲۷		
اپریل	۶۷۴	۶۲۲	۹۲۲-	۲۰۲		
مئی ۱-۱۰	۳۰۴	۴۴	۶۴۰-	۱۰۵		
مئی ۱۱-۳۱	۴۸۸۹	۱۹۱۰	۷۰۴۴-	۱۰۸۸	۱۱۳	
جون	۱۴۳۷۹	۴۸۱۰	۱۸۴۹۰-	۲۲۸۵	۲۳۶	۳۳
جولائی	۱۱۲۴۶	۴۳۸۳	۲۲۴۴۱-	۳۸۰۷	۱۵۹	۲۷۳
اگست☆	۳۴۲۸	۱۰۳۸	۵۴۰۱-	۱۵۱۵	۵	۲۶
مجموعی فائر	۳۶۴۶۶	۱۴۳۸۷	۵۶۷۹۳-	۹۳۵۷	۵۲۵	۳۳۲

☆ ۲۰-۲۱ اگست کی درمیانی رات تک

عام توپوں کا مجموعی فائر پاکستانی ۱۱۷۸۶۰ بھارتی ۷۷۷۹۳

مندرجہ بالا گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۹۹۹ء کے بعد گولہ باری کی تعداد میں اچانک اضافہ ہوگیا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مئی کے پہلے ہفتے میں بھارت کو دراندازی کی خبر ہوئی تو وہ اپنی توپیں آگے لائے اور انہوں نے مقبوضہ چوکیوں پر بمباری شروع کر دی۔ پاکستان نے بھی مزید توپیں منگوائیں اور ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جب پاکستانیوں کا لائن آف کنٹرول کے پار ٹھہرنا مشکل ہوگیا تو یونٹوں کو واپس آنے کے احکامات دیے گئے۔ اس واپسی اپریشن کے لیے بھی آرٹلری کور کی ضرورت تھی، اس لئے دونوں طرف گولہ باری میں یک دم اضافہ نظر آتا ہے۔ مئی سے پہلے کے مہینوں میں ہونے والی گولہ باری دراصل ان علاقوں سے متعلق ہے جہاں ویسے بھی جھڑپیں جاری رہتی ہیں جیسے سیاچن۔

شباب جس کا ''تھا'' بے داغ، ضرب ''تھی'' کاری

کرنل شیر کا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع صوابی کے ایک گاؤں نواں کلی سے تھا۔ شجاعت اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے دادا، خان گلاب نے رضا کارانہ طور پر ۱۹۴۸ء کی آزادی کشمیر کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور فاتح بن کر لوٹے تھے۔ وردی پہننے والے انہیں پسند تھے اور اپنے پوتے کی پیدائش پر انہوں نے اس کا نام ''کرنل شیر'' رکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا پوتا فوج میں شمولیت اختیار کرے اور کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا پوتا فوج میں جانے کے بعد جب لیفٹیننٹ ہو کر خود کو ''لیفٹیننٹ کرنل شیر'' کہے گا تو کیا مصیبت کھڑی کرے گا۔

کرنل شیر کے والد خورشید خان توانا صحت کے مالک ہیں اور ستر سال کی عمر میں بھی جوانوں کی طرح کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ شیر نے انہیں یا اپنی والدہ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ فرمانبردار، دیانتدار اور محنتی تھے۔ انہوں نے انٹر، گورنمنٹ کالج صوابی سے کیا۔ پری میڈیکل کے مضامین پڑھے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان ایرفورس میں بھرتی کی درخواست دی اور ایر مین کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔ لیکن لگن تو فوج میں جانے کی تھی کہ دادا کی خواہش بھی یہی تھی۔ چنانچہ کمیشن کے لیے درخواست دی۔ پہلی کوشش میں ناکام ہوئے، البتہ دوسری

کوشش میں کامیاب ہو گئے۔

کرنل شیر نے ۹۰ لانگ کورس میں شمولیت اختیار کی اور اکتوبر ۹۲ء سے ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۴ء تک وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں زیر تربیت رہے۔ ان کا تعلق عبیدہ کمپنی سے تھا۔

سید عون مرتضیٰ ان کے کورس میٹ تھے۔ وہ ذرا تاخیر سے پی ایم اے پہنچے تھے اور ان اسباق میں حاضر نہیں تھے جن میں "فوجی آداب زندگی" کی تعلیم دی جاتی ہے۔

نتیجہ؟ وہ جہاں جاتے کوئی نہ کوئی غلطی کرتے اور شامت پوری پلاٹون کی آتی۔ پلاٹون کے بہت سے لوگ انھیں کوستے لیکن کرنل شیر ان کی مدد کو آتے اور ساتھیوں کو سمجھا بجھا کر ان کا غصہ ٹھنڈا کرتے۔

کرنل شیر جب پی ایم اے پہنچے تو پہلے سے متشرع صورت تھے۔ انہیں کہا گیا کہ وہ ڈاڑھی صاف کر دیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ جب وہ آخری ٹرم میں تھے تو انہیں "غیر سرکاری" طور پر بتایا گیا کہ اپنی اچھی کارکردگی کی وجہ سے انہیں کوئی اچھی اپوائنٹمنٹ مل سکتی ہے بشرطیکہ ڈاڑھی صاف کر دیں۔ انہوں نے پھر انکار کر دیا۔ تاہم انہیں بٹالین کوارٹر ماسٹر کی اپوائنٹمنٹ مل ہی گئی۔ کیپٹن علی الحسنین ان سے ایک کورس جونیئر تھے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں جونیئر کیڈٹوں کو سینئر کیڈٹوں کی طرف سے ڈانٹ ڈپٹ ہوتی رہتی ہے۔ گالیاں بھی سننے کو ملتی ہیں۔ ناپختہ ذہن انگریزی میں سیکھی گئی یہ گالیاں از بر کر لیتے ہیں اور جب خود سینئر ہوتے ہیں تو بڑے فخر سے جونیئر کیڈٹوں پر آزماتے ہیں۔ کرنل شیر کی بات الگ تھی۔ وہ جونیئر کیڈٹوں کو ستاتے تو تھے لیکن ان کی زبان کبھی گالیوں سے آلودہ نہ ہوئی، گری ہوئی بات ان کا وطیرہ نہ تھا۔

وہ بٹالین کوارٹر ماسٹر کی حیثیت سے پاس آؤٹ ہوئے اور ان کی پہلی تعیناتی ۲۷ سندھ رجمنٹ میں ہوئی جو اس وقت اوکاڑہ میں تھی۔ ان کا ایک رفیق کار، کیپٹن

کلیم کریم تھا۔ اس کا بیان ہے کہ کرنل شیر شوخ طبیعت کا مالک تھا۔ اس کا قہقہہ بڑا بھرپور ہوا کرتا۔ ایک دفعہ کیپٹن کلیم نے انہیں کہا،

"مجھے تم سے پیار ہے"۔

"کس لیے؟"

"تمھارے قہقہے کی وجہ سے"۔ کرنل شیر نے قہقہہ لگایا، پھر پوچھا

"اچھا! میں ویسے بھی خوبصورت لگتا ہوں؟"

"بہت خوبصورت"۔

انھوں نے ایک اور قہقہہ لگایا، پھر بڑی سنجیدگی سے کہا،

"وردی میں رہنے کے لیے مجھے خوبصورت نظر آنے کی ضرورت نہیں۔ دلیر، نڈر اور بے خوف ہونے کی ضرورت ہے اور بے خوفی تقویٰ سے آتی ہے"۔

۷۹ء میزائل بیٹری کے کیپٹن وحید الزماں کی کرنل شیر سے پہلی ملاقات پاکستان ملٹری اکیڈمی میں پہلی ٹرم کے دوران ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ کرنل شیر نے کبھی نماز قضا نہیں کی۔ ڈرل کی ریہرسل کے وقفوں کے دوران جب سب تھکن سے نڈھال ہو کر ستا رہے ہوتے، کرنل شیر ڈرل سکیر کے ارد گرد لان میں یا قریب ہی واقع بٹالین میس کے برآمدے میں ظہر یا عصر کی نماز ادا کرتے۔ اکیڈمی میں قیام کے دوران ان کے بھائی ان کی مالی ضرورتیں پوری کرتے۔ کمیشن ملنے کے بعد وہ بھائی کی ضروریات کا خیال رکھتے۔

یونٹ میں جب کرنل شیر سینئر ہو گئے تو وہ اپنی موجودگی میں ٹی وی پر بھارتی چینل کی قطعاً اجازت نہ دیتے۔ وہ اپنے رفقائے کار اور جونیئر افسروں کو تلقین کرتے کہ ہر وقت اللہ کا ذکر کریں۔ وہ کہتے "اللہ کے سارے نام ہی مقدس اور بابرکت ہیں، اسے کسی بھی نام سے پکارو، وہ ہر وقت تمہارے ساتھ ہو گا"۔

وقار اور عزت ان کا شیوہ تھا۔ اپنی یا کسی سرکاری ضرورت کے لیے انہوں نے

کسی کی منت سماجت نہیں کی۔ ایک بار انھوں نے یونٹ کے کوارٹر ماسٹر کو سادہ سا خط لکھا کہ ان کی پلاٹون کے لیے تین سٹوو مہیا کیے جائیں۔

کوارٹر ماسٹر نے کرنل شیر سے کہا کہ وہ اپنے خط میں "پلیز" کے لفظ کا اضافہ کر دیں۔

کرنل شیر نے کہا کہ انھوں نے درخواست نہیں دی، ڈیمانڈ دی ہے، سرکاری ضرورت کے لئے جائز ڈیمانڈ۔ میں منت کیوں کروں۔

"تمھیں سٹوو تب ہی ملیں گے جب تم پلیز کہو گے۔ چلو زبانی ہی کہہ دو"۔

"میں یہ لفظ بھی نہیں بولوں گا اور سٹوو بھی لوں گا"۔

انھیں سٹوو مل گئے۔

کرنل ان کے نام کا حصہ تھا اور وہ اسے بڑے فخر سے استعمال کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس سے کنفیوژن بھی پیدا ہوتا۔ اگر وہ فون پر ہوتے اور گھنٹی بجنے پر کہتے، لیفٹیننٹ کرنل شیر تو فون کرنے والا سمجھتا کہ کمانڈنگ آفیسر خود فون پر ہیں۔ وہ انھیں سر سر کہہ کر مخاطب کرتا، کرنل شیر مسکراتے، بتاتے کہ وہ لیفٹیننٹ شیر بول رہے ہیں اور پھر کمانڈنگ آفیسر سے ملا دیتے۔

انگریزی ان کی بہت اچھی تھی۔ افسروں سے سکریبل کھیلتے تو زبان پر ان کی مہارت صاف ظاہر ہوتی۔ وہ اکثر جیت جاتے۔ الگ تھلگ چوکیوں پر تعیناتی کے دوران جہاں افسروں کی صحبت میسر نہ آتی، وہ جوانوں میں گھل مل کر رہتے اور ان سے لڈو کھیلتے۔ جوانوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں انھیں کوئی عار نہ تھا۔

کرنل شیر ذہین و فطین شخص تھے اور اپنی صلاحیتوں کو فراست سے استعمال کرتے۔ جب وہ ڈومیل سیکٹر میں تھے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی مخالف چوکیوں پر دشمن کے سپاہیوں نے السیشن کتے پال رکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کسی کا شوق ہو یا پھر احتیاطی تدبیر کہ رات کو کوئی ان کی طرف آئے تو انہیں خبر ہو جائے۔ کیپٹن شیر کو ان کا

بھونکنا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ خود ایک ماہر نشانہ باز تھے اور کتوں کو نشانہ بنانا چنداں مشکل نہ تھا لیکن حکم یہ تھا کہ بلا ضرورت فائر نہ کھولا جائے۔ انہوں نے ایک ترکیب سوچی۔ کہیں سے ایک کتیا پکڑی اور اسے اپنی چوکی کے پاس کسی بانس سے باندھ دیا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ جانوروں پر ملاپ کا موسم آتا ہے تو مادہ جانوروں کے جسم سے ایک خاص قسم کی خوشبو نکلتی ہے۔ ہوائیں اس خوشبو کو اڑا کر چاروں طرف لے جاتی ہیں۔ نر جانور اس خوشبو کی مدد سے مادہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہوا کی سمت بدلنے سے مادہ کا سراغ نہ ملے تو وہ ایک خاص لے میں آوازیں نکالتے ہیں۔ مادہ ان کا جواب دیتی ہے اور بالآخر وہ ایک دوسرے تک پہنچ جاتے ہیں۔ شاید کرنل شیر کو یہ حقیقت معلوم تھی۔ کتیا مختلف آوازیں نکال نکال کر کتوں کو بلاتی رہتی۔ وہ بے تاب ہو کر اس طرف آنا چاہتے لیکن شاید دشمن کے فوجیوں کو اس تدبیر کا مقصد سمجھ میں آ گیا۔ انہوں نے کتوں کو باندھ دیا۔ رات کو انہیں کھول دیا جاتا۔ کرنل شیر نے تین راتوں تک کتیا کو باندھے رکھا اور پھر اس کا پٹہ کھول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ کتیا، کتوں کو اپنے پیچھے لگا کر واپس لے آئے گی لیکن وہ کتوں کے ساتھ کہیں اور چلی گئی۔ وہ واپس آئی نہ کتے۔ حاصل نہ وصول۔ لیکن کتوں سے جان چھوٹ گئی۔

کرنل شیر کو کچھ کرنے کے لیے حکم کا انتظار نہیں ہوتا تھا۔ سیماب صفت افراد کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے ویسے ہی مضطرب رہتے ہیں۔ جنوری ۱۹۹۸ء میں وہ ڈومیل سیکٹر میں تھے۔ ان کی چوکیوں کے بالمقابل دشمن کی ایک مشاہداتی چوکی تھی جس کی وجہ سے کافی پریشانی رہتی تھی۔ سردیوں میں جب دشمن کے فوجی چوکی خالی کر کے واپس چلے گئے تو یونٹ نے اس چوکی پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ یونٹ میں ابھی اس کے لئے مشاورت اور بالا ہیڈ کوارٹر کی طرف سے اجازت لینے پر غور ہی ہو رہا تھا کہ ایک دن کیپٹن کرنل شیر نے اطلاع دی کہ انہوں نے مشاہداتی چوکی پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ

اپنے دو ساتھیوں سمیت اس چوکی پر تشریف فرما ہیں۔ کمانڈنگ آفیسر پریشان، کچھ سمجھ نہ آئے کہ کیا کیا جائے۔ انہوں نے فوری طور پر بالا ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی اور اجازت چاہی کہ اس چوکی پر قبضہ جاری رکھا جائے۔ یہ معاملہ کور ہیڈ کوارٹر تک پہنچا۔ اس وقت لیفٹنٹ جنرل سلیم حیدر ۱۰ کور کی کمانڈ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کارروائی پر صاد کرنے سے انکار کر دیا۔ کرنل شیر کو واپس آنے کا حکم دیا گیا۔ وہ واپس تو آگئے لیکن دشمن کے بنکروں میں جو کچھ تھا، اٹھا لائے۔ جن میں کچھ دستی بم تھے، دو چار وردیاں، ایک وائگر گن کے میگزین، گولیاں اور سلیپنگ بیگ۔

۲۷ اپریل ۱۹۹۹ء کو وہ کسی سرکاری کام سے سکردو آئے۔ یہاں ان کی ملاقات کیپٹن وحید سے ہوئی۔ وہ انہی کے پاس ٹھہرے۔ دمِ واپسی انہوں نے وحید سے کہا کہ وہ ان کی شہادت کے لیے دعا کریں۔ ان کے الفاظ تھے، ''میری خواہش ہے کہ واپس جاؤں تو چار کندھوں پر''۔

کیپٹن مرتضیٰ، کرنل شیر کے کورس میٹ تھے۔ وہ ۶۲ برگیڈ ہیڈ کوارٹر میں تعینات تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جب کرنل شیر کو ان کے آخری مشن پر بھیجا جا رہا تھا تو بریفنگ کے بعد ان سے معمول کے مطابق پوچھا گیا، ''کوئی شک؟'' انہوں نے کہا کہ انہیں کوئی شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ اصل نجات شہادت میں ہے۔ جو جہاد اور شہادت پر یقین نہیں رکھتا ہے وہ ایمان سے خالی ہے۔

کیپٹن کرنل شیر نے گشت کے دوران مشکوہ نالے میں دشمن کے ایک کیمپ کا سراغ لگایا۔ انہوں نے کمانڈنگ آفیسر کو اطلاع دیتے ہوئے اس کیمپ پر حملے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر انہوں نے سات افراد کا انتخاب کیا جس میں ڈیلٹا کمپنی کے حوالدار میجر نرگس شاہ، سپاہی عرفان، غلام محمد، مہر دین، محمد حسین اور شبیر شامل تھے۔ دو بھاری مشین گنیں، ایک آر پی جی۔ ۷، دستی بم، چار جی تھری رائفلیں اور ایک میٹرولا سیٹ ساتھ لیے۔ ۲۲ جون کی نصف شب بیت چکی تھی جب وہ اپنی

چوکی سے روانہ ہوئے۔ صبح ساڑھے چار بجے مطلوبہ علاقے میں پہنچ گئے۔ دشمن کے کیمپ پر ہو کا عالم طاری تھا۔ سخت سردی میں خواب خرگوش کے مزے۔ کیپٹن شیر نے دو دو افراد کے چار گروپ بنائے۔ تین کو بھاری ہتھیار دے کر مختلف جگہوں پر تعینات کیا اور ہدایت کی کہ فائر صرف ان کے حکم پر کھولا جائے۔ پھر انھوں نے سپاہی عرفان کو ساتھ لیا اور دشمن کے کیمپ کی طرف اتر گئے۔ کیمپ کے نکڑ پر سنتریوں کی چوکی میں جھانکا تو دو سپاہی سوئے ہوئے ملے۔ دو مشین گنیں فکس لائن پر لگی ہوئی تھیں، جن میں سے ایک کا رخ مشکوہ نالے کی طرف تھا جہاں کیپٹن شیر نے اپنے فوجی متعین کیے تھے اور دوسری کا رخ کسی اور جانب تھا۔ کیپٹن شیر نے ان گنوں کے میگزین نکال کر اپنے قبضے میں لے لئے اور اپنے پٹھو جھولے میں ڈال لئے پھر سپاہی عرفان کو اشارہ کیا کہ دونوں سنتریوں کو گلا گھونٹ کر مارنا ہے، آواز نہ نکلنے پائے۔ دونوں آہستگی سے سنتریوں کے پاس پہنچے اور ان کے گلے دبوچ لیے۔ کرنل شیر تو اپنے سنتری کو ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گئے، لیکن دوسرا سنتری عرفان کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ کیپٹن شیر کو اپنی پستول استعمال کرنی پڑی۔ آواز سے کیمپ میں ہلچل ہوئی اور کون ہے؟ کون ہے؟ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دونوں کیمپ سے نکل کر بھاگے تو پیچھے سے فائر ہوا۔ سپاہی عرفان شدید زخمی ہو کر گر پڑا۔ کیپٹن شیر اسے گھسیٹ کر ایک تودے کے پیچھے لے گئے اور اپنے لوگوں کو فائر کھولنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد فائرنگ روک دی گئی۔ کیپٹن شیر نے اپنے تین ساتھیوں کو نیچے آنے کو کہا تاکہ عرفان کو سہارا دے کر واپس لے جایا جائے۔ وہ اسے سنبھال ہی رہے تھے جب اس نے آخری ہچکی لی اور خالق حقیقی سے جا ملا۔ اس دوران بھارتی توپخانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ کیپٹن شیر نے حکم دیا کہ سپاہی عرفان کا پٹھو جھولا اتار کر نالے میں پھینک دیا جائے اور ہتھیار سنبھال لیے جائیں۔ ایک بھاری مشین گن بھی نالے میں پھینک دی گئی۔ اس وقت تک سورج نکل

آیا تھا، مطلع صاف تھا اور خلاف معمول دور دور تک صاف نظر آتا تھا۔ دشمن کے طیارے بھی سر پر آپہنچے اور انھوں نے بم گرانا شروع کر دیے۔

شیر اور ان کے ساتھیوں نے مجبوراً عرفان کو ایک تودے کے پیچھے لٹایا اور خود دشمن کے کیمپ سے دور ہٹ گئے۔ جب جہاز واپس چلے گئے اور توپخانے کی گولہ باری ختم ہو گئی تو کیپٹن شیر اور ان کے ساتھی، سپاہی عرفان کی نعش اٹھانے واپس آئے لیکن اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ دشمن کے فوجی اس کی نعش اٹھا لے گئے تھے جو بعد میں واپس نہیں کی گئی۔ بھارتیوں کے سنے گئے پیغامات سے پتہ چلا کہ اس حملے میں ۳۸ فوجی ہلاک ہوئے۔ کیپٹن شیر کی وردی پر سپاہی عرفان کے خون کے دھبے تھے۔ اس کے اردلی نے کہا کہ وہ وردی اتار دیں تا کہ دھو دے اور خون کے دھبے صاف کر دے۔ کیپٹن شیر نے نرمی سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ ایک شہید کے خون کے دھبے ہیں اور ان دھبوں والی وردی پہننا ایک سعادت ہے۔

۴ جولائی ۱۹۹۹ء کو کیپٹن شیر کو ٹائیگر ہلز جانے کو کہا گیا۔ وہاں تین دفاعی چوکیاں قائم کی گئی تھیں جن کے کوڈ نام ۱۲۹ اے، بی، اور سی تھے، جبکہ عرفی نام کلیم چوکی، کاشف چوکی، اور وکیل چوکی تھے۔ دشمن ۱۲۹ اے اور بی کے درمیان گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ۱۲۹ بی پر اس وقت میجر ارشد ہاشم موجود تھے جنھوں نے میجر سعید ناگرا کی جگہ لی تھی جو بری طرح زخمی ہونے کے بعد پیچھے بھیج دیے گئے تھے۔ انہیں چار گولیاں لگی تھیں، دو بازوؤں میں اور دو ٹانگوں میں۔ کیپٹن شیر، شام چھ بجے موقع پر پہنچے اور پوری صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ علی الصبح دشمن پر عین سامنے سے حملہ کریں گے۔

رات کو انھوں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور شہادت کی فضیلت پر مختصر گفتگو کی۔ یہ گفتگو اتنی موثر تھی کہ بریو کمپنی کا کمپنی حوالدار میجر بھی جو پاس بیٹھا یہ گفتگو سن رہا تھا، انکے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا لیکن کیپٹن شیر نے اسے پیچھے رہ کر انہیں کور نگ

فائر مہیا کرنے کو کہا۔ صبح کو کیپٹن عمار بھی ان سے آملے۔ صبح کیپٹن شیر اور ان کے ساتھیوں نے نماز فجر ادا کی اور شوق شہادت سے سرشار قیامت بن کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کے چار سپاہی بری طرح زخمی ہوئے، باقی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۱۲۹ اے اور بی کے درمیان رکاوٹ ختم ہو گئی۔ کیپٹن عمار اور کیپٹن کرنل شیر آگے جا کر میجر ہاشم سے ملے، وہ باہم گفتگو کر رہے تھے کہ دشمن نے پوری قوت سے جوابی حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میجر ہاشم نے اپنے توپخانے کو خود اپنی پوزیشن پر گولہ باری کے لیے کہا۔ یہ ایک انتہائی قدم تھا لیکن ضرورت پڑنے پر اس کے سوا کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن ان مورچوں پر قبضہ نہ کر سکے۔ اب ایک طرف تو اپنے توپخانے کے گولے برس رہے تھے اور دوسری طرف میجر ہاشم، کیپٹن شیر، عمار اور ان کے ساتھی دشمن کی کثیر تعداد سے دست بدست جنگ میں مصروف تھے۔ وہ آخری سانسوں تک مردانہ وار لڑتے رہے اور ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کیپٹن کرنل شیر کی نعش دشمن اٹھا کر لے گئے اور انہیں دہلی منتقل کر دیا گیا۔ دو ہفتوں کی تاخیر کے بعد ان کی نعش واپس کی گئی۔

۱۸ جولائی کی آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ ملیر چھاؤنی اور کراچی میں تعینات سینکڑوں فوجی کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر جمع تھے۔ شہریوں اور سیاسی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ یہ سب لوگ کیپٹن کرنل شیر کی میت وصول کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے جو بھارتی دارالحکومت دہلی سے کراچی لائی جا رہی تھی۔

کیپٹن کرنل شیر کے دو بھائی بھی صوبہ سرحد کے آبائی گاؤں سے یہاں پہنچ چکے تھے۔ سیاسی کارکنوں نے پاک فوج زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے لیکن جب وہ رن وے کی طرف آئے اور انھوں نے فوجیوں کو پورے نظم وضبط کے ساتھ قطار در

قطار کھڑے دیکھا تو وہ بھی خاموش ہو گئے اور فوجیوں کے پیچھے قطاریں باندھ لیں۔

ایک بج کر پانچ منٹ پر طیارہ رن وے پر اترا۔ ٹیکسی کرنے کے بعد جب وہ مخصوص جگہ پر آ کر کھڑا ہوا تو اس کا عقبی حصہ کھولا گیا اور دو تابوت باہر نکالے گئے۔ ان میں سے ایک تابوت کیپٹن کرنل شیر کا تھا اور دوسرا ایک نا معلوم سپاہی کا جس کی شناخت ہونا باقی تھی۔ تابوت ایک ایمبولنس میں رکھ کر اس جگہ پر لائے گئے جہاں فوجی اور شہری صف بندی کیے کھڑے تھے۔ بلوچ رجمنٹ کے ایک چاق و چوبند دستے نے تابوت ایمبولنس سے اتارے اور سلو مارچ میں چلتے ہوئے صفوں کے سامنے آئے اور تابوت زمین پر رکھ دیے۔ یونٹ کے ایک خطیب نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر قرآن مجید کی یہ آیات تلاوت کیں:

ولا تقو لوالمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون ○

اور جو اللہ کے راستے میں مارے جائیں، انھیں مردہ مت کہو کہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں۔

نماز کے بعد تابوت پاک فضائیہ کے ایک خصوصی طیارے میں رکھے جانے تھے۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر حسین عثمانی، گورنر سندھ ماموں حسین، رکن قومی اسمبلی حلیم صدیقی اور گورنر سندھ کے مشیر دوست محمد فیضی نے کیپٹن شیر کا تابوت اٹھایا اور چند قدموں بعد دوسروں نے سنبھال لیا۔ جب تابوت طیارے کے اندر رکھ دیے گئے تو کور کمانڈر، گورنر اور فوجی دستوں نے سلامی دی جبکہ شہریوں نے نمناک آنکھوں سے الوداع کہا۔ تھوڑی دیر بعد طیارہ اسلام آباد کی طرف پرواز کر گیا۔ اسلام آباد ایر پورٹ پر ایک بار پھر نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں صدر پاکستان جسٹس (ریٹائرڈ) رفیق تارڑ بھی شامل تھے۔ اسلام آباد سے کیپٹن کرنل شیر کا جسد خاکی ایک ہیلی کاپٹر میں ان کے آبائی گاؤں پہنچایا گیا جہاں ہزاروں افراد اپنے ہیرو کو خراج تحسین پیش

کرنے اور جنازے میں شرکت کے لیے جمع تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ضلع صوابی میں اس سے پہلے اتنا بڑا مجمع کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ جنازے میں صوبہ سرحد کے گورنر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد عارف بنگش، صوبائی وزیر غفور جدون اور وزیر اعلیٰ کے خصوصی معاون میجر (ریٹائرڈ) عامر شامل تھے۔

کیپٹن کرنل شیر کے بڑے بھائی انور شیر نے جو ابو ظہبی کے شہر العین میں کاروبار کرتے ہیں، بتایا کہ ان کے خاندان نے کرنل شیر کی شادی کے لیے پانچ لاکھ روپے مختص کر رکھے تھے اور یہ طے تھا کہ شمالی علاقوں سے واپسی پر ان کی شادی کر دی جائے۔ ان کی شہادت کے بعد یہ رقم نواں کلی میں ایک سکول کھولنے کے لیے وقف کر دی گئی۔



ہے تری شان کے شایاں، اسی مومن کی نماز

میجر عبدالوہاب کا تعلق شمالی علاقوں میں واقع تحصیل ہیڈ کوارٹر، استور سے تھا۔ ان کا گاؤں ''پرشنگ رام کھا''، استور سے چند میل پرے واقع ہے۔ ان کے گاؤں کے قریب ایک نالہ بہتا ہے جو کسی دریا سے کم نہیں۔ اس کا دھارا اتنا تند و تیز ہے کہ اچھے بھلے توانا اور صحتمند آدمی بھی اسے تیر کر پار نہیں کر سکتے۔ جانے کس نے اس جھاگ اڑاتے دریا کا نام نالہ رکھ چھوڑا۔ میجر وہاب اس کے کنارے واقع گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماموں اسلم عبداللہ گلگت مین فیڈرل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے عبدالوہاب کی پرورش اور تعلیم دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی آپ بنائی تھی اور جس مقام پر آج وہ ہیں، یہاں تک پہنچنے کے لئے سخت جدو جہد کی تھی۔ ان کے چچا امان اللہ ۱۹۶۶ء میں انہیں کراچی لے گئے تھے۔ وہ طویل عرصے تک وہاں رہے اور اردو کالج سے ایم اے کیا۔ ۱۹۷۸ء میں انہیں شماریات ڈویژن میں ملازمت ملی۔ انہیں چونکہ پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا اس لئے وہ شعبہ تعلیم میں آنے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر ۲۵ اپریل ۱۹۸۸ء کو ان کی تعیناتی لیکچرر کے طور پر ہوگئی۔

۱۹۷۴ء میں وہ گاؤں گئے تو عبدالوہاب کو کھیل کود میں وقت ضائع کرتے

ہوئے پایا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ کراچی لے گئے اور لی مارکیٹ کے قریب واقع میری ڈیل سکول میں داخل کروا دیا۔ یہ سکول اسلم عبداللہ کے چچا امان اللہ نے قائم کیا تھا۔ وہ ایک مخلص تعلیم دان تھے اور ان کا پختہ یقین تھا کہ شمالی علاقوں کے لوگوں کی غربت کا حل انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کراچی میں دو سکول قائم کئے تھے۔ ایک میری ڈیل سکول انگلش میڈیم اور دوسرا حبیبہ پبلک سکول جہاں شام کو تعلیم دی جاتی تھی۔ شمالی علاقوں سے جو لڑکا بھی اترتا وہ پہلے یہاں پہنچتا تھا۔ امان اللہ ان کی تعلیم کا اہتمام کرتے، انہیں ٹھہراتے اور ان کے لئے روزگار کا بندوبست کرتے۔ آج شمالی علاقوں میں جو مقامی لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، وہ کسی نہ کسی طور ان کے مرہون منت ہیں۔

عبدالوہاب کو پہلے میری ڈیل سکول میں داخل کیا گیا اور بعد میں حبیبہ پبلک سکول میں منتقل کر دیا گیا جہاں انہوں نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ انہیں اپنی انگریزی بہتر بنانے کا بہت شوق تھا۔ اسلم عبداللہ صاحب نے انہیں انگریزی کے ایک استاد، غلام محمد سے متعارف کروایا جو سولجر بازار میں رہتے تھے۔ عبدالوہاب ان سے سبق لینے پیدل وہاں جاتے اور کبھی کبھار رات گئے تک واپس آتے۔ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد مئی ۱۹۷۷ء میں وہ ملٹری کالج جہلم کے لئے منتخب ہو گئے۔ اسلم عبداللہ انہیں ٹرین میں کراچی سے جہلم لائے۔ اس وقت وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک عروج پر تھی۔ مختلف شہروں میں فوج بلا لی گئی تھی اور کئی جگہوں پر کرفیو نافذ تھا۔ یہ لوگ جب جہلم کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم۔ یہ کسی نہ کسی طرح ایک قریبی ہوٹل پہنچے اور رات وہیں گزاری۔ صبح بھرپور ناشتہ کے بعد وہ ملٹری کالج سرائے عالمگیر پہنچے۔ جمعے کا دن تھا ضابطے کی کاروائیاں مکمل کرنے کے بعد اسلم عبداللہ نے بھانجے کو خدا حافظ کہا اور خود کراچی لوٹ گئے۔

ملٹری کالج جہلم سے میٹرک کرنے کے بعد عبدالوہاب نے جونیئر کیڈٹ بٹالین میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت یہ ایک نئی سکیم تھی جو بعد میں ختم کر دی گئی۔ اس سکیم میں فوج میٹرک پاس جوانوں کو بھرتی کر کے فوجی ماحول میں ان کی تربیت کا اہتمام کرتی تھی۔ ساتھ ساتھ انہیں پڑھایا بھی جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد یہ جوان پاکستان ملٹری اکیڈمی جاتے تھے جہاں فوجی تربیت کے ساتھ ساتھ گریجویشن بھی کرائی جاتی تھی۔ عبدالوہاب ان سب نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے ستمبر ۱۹۸۴ء میں کمیشن لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی پہلی تعیناتی ۳۲ بلوچ رجمنٹ میں ہوئی جو اس وقت ملیر چھاؤنی میں مقیم تھی۔

عبدالوہاب خوش قسمت تھے کہ انہیں فوج کے لئے منتخب کیا گیا کہ انہیں فوج میں آنے کا شوق تھا اور فوج خوش قسمت تھی کہ ان جیسا آدمی فوج کو ملا کہ فوج کو انہی جیسے لوگوں کی ضرورت تھی اور ہے۔ وہ نہ صرف جسمانی طور پر تنومند تھے بلکہ باکردار بھی تھے۔

ملیر میں قیام کے دنوں میں انہیں سندھ میں ڈاکوؤں کی سرکوبی کی ذمہ داریاں سونپی گئیں جو انہوں نے بڑی بے باکی سے انجام دیں اور کم عمری ہی میں ستارۂ بسالت سے سرفراز کئے گئے۔

۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۲ء تک کیپٹن وہاب فورس کمانڈ ناردرن ایریا ہیڈکوارٹر میں سٹاف کیپٹن کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس وقت کے ایف سی این اے کمانڈر میجر جنرل ظہیر الاسلام عباسی نے ان کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا کیا۔ چھ ماہ تک وہ ان کے اے ڈی سی بھی رہے۔ ایف سی این اے ہیڈکوارٹر میں قیام کے دوران صبح سویرے وہ درس قرآن دیتے تھے جس میں ہیڈکوارٹر کے تمام افسر حاضر ہوتے تھے۔

وہ اپنے علاقے کے لوگوں کو فوج میں شمولیت کے لئے آمادہ کرتے رہتے تھے ۳۶ فرنٹیر فورس رجمنٹ کے کیپٹن عبیداللہ نے بتایا کہ ۱۹۹۰ء میں وہ فیڈرل گورنمنٹ

کالج گلگت میں زیر تعلیم تھے اور عبدالوہاب ایف سی این اے ہیڈ کوارٹر میں تعینات۔ کالج کے ایک لیکچرار اسلم عبداللہ جب عبدالوہاب سے ملنے جاتے تو عبید اللہ کو بھی ساتھ لے جاتے۔ ان کا رویہ بڑا دوستانہ اور مشفقانہ ہوا کرتا۔ عبید اللہ کو بی فارمیسی کے لئے منتخب کر لیا گیا تھا لیکن میجر عبدالوہاب نے انہیں فوج میں شامل ہونے کے لئے قائل کر لیا۔ عبید اللہ کا کہنا ہے کہ میجر عبدالوہاب اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر مرد کی طرح جینا ہے تو تمہارے لئے فوج کے سوا کوئی اور جگہ نہیں۔ عبید اللہ قائل ہو گئے۔ اور انہوں نے کمیشن کے لئے درخواست دے دی۔ پہلی مرتبہ وہ مسترد کر دیئے گئے اور سخت مایوس ہوئے لیکن میجر وہاب نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور دوبارہ درخواست دینے کو کہا۔ اس مرتبہ وہ منتخب کر لئے گئے۔ انہوں نے پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ۸۷ویں لانگ کورس میں شمولیت اختیار کی۔ پاسنگ آؤٹ پر انہیں سگنلز کور میں کمیشن ملا۔ میجر عبدالوہاب کو پتہ چلا تو انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور عبید اللہ سے انفنٹری میں جانے کو کہا۔ وہ کہا کرتے تھے "ہم شمالی علاقوں کے لوگ انفنٹری میں جانے کے سب سے زیادہ اہل ہیں"۔ عبید اللہ نے تبدیلی کی درخواست دی جو منظور کر لی گئی اور وہ ۳۶ فرنٹیئر فورس میں تعینات کر دیئے گئے۔ بعد ازاں کپتان کی حیثیت سے انہوں نے ۶۲ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں انٹیلی جنس آفیسر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔

ایف سی این اے ہیڈ کوارٹر سے میجر عبدالوہاب اپنی یونٹ ۳۲ بلوچ رجمنٹ میں تعینات ہوئے جو اس وقت چونیاں میں مقیم تھی۔ وہاں سے ان کی تبدیلی واہ میں مقیم ۶۹۹ فیلڈ انٹیلی جنس یونٹ میں ہوئی۔ اس وقت وہاں ڈاکوؤں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ میجر عبدالوہاب نے اتنے زبردست حفاظتی اقدامات کئے کہ ڈاکے بالکل ختم ہو گئے۔ وہاں قیام کے دوران فوج کے ایک کپتان ناصر جمشید کسی اپریشن میں شہید ہوئے۔ ان کا جسد خاکی واہ لایا گیا جسے وصول کرنے میں میجر عبدالوہاب بھی شامل

تھے۔ اس موقع پر انہوں نے شہید کے والد کو مبارکباد دی اور کہا کہ ان کا بیٹا بہت خوش قسمت تھا کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔ ہم کب سے اس رتبے کے لئے دعا کر رہے ہیں لیکن اس کا کوئی موقع ملتا نظر نہیں آتا۔

انہیں جب شمالی علاقوں میں فوجی سرگرمیوں کا علم ہوا تو وہ بے چین ہو گئے اور انہوں نے ملٹری سیکرٹری برانچ میں درخواست بھیجی کہ انہیں شمالی علاقوں میں تعینات کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے چیف آف جنرل سٹاف کو بھی ایک خط لکھا۔ انہوں نے موقف اختیار کیا کہ چونکہ ان کا تعلق شمالی علاقوں سے تھا اور وہ نہ صرف علاقے سے بخوبی واقف تھے بلکہ وہاں کے مقامی فوجی جوانوں کی زبان بھی سمجھتے تھے، ان کا حق تھا کہ انہیں وہاں لڑنے کا موقع دیا جائے۔ خط بڑا جذباتی اور تاثراتی تھا۔ ان کی درخواست مان لی گئی اور انہیں ۶ ناردرن لائٹ انفنٹری بٹالین میں تعینات کر دیا گیا۔ جب ان کی تبدیلی کے احکامات وصول ہوئے تو انہوں نے واہ کی جامع مسجد میں کسی نماز کے بعد لوگوں سے درخواست کی کہ وہ ان کی شہادت کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے اپنے اہل خانہ کو وہیں چھوڑا اور گلگت کی پرواز کے لئے راولپنڈی پہنچ گئے۔ موسم ابر آلود تھا۔ جب دو دنوں تک گلگت کا جہاز نہ گیا تو وہ سڑک کے راستے روانہ ہو گئے اور ۲۲ جون ۱۹۹۹ء کو گلگت پہنچ گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ان کے ایک رشتہ دار ڈاکٹر منظور سے ہوئی۔ انہوں نے ڈاکٹر منظور سے بڑی سنجیدگی سے درخواست کی کہ فجر کی نماز کے بعد سورۃ یٰسین، سورہ قریش اور گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ کر ان کی شہادت کے لئے دعا کریں۔ انہوں نے بتایا کہ سید احمد شہید بریلوی کا بھی یہ معمول تھا۔ انہوں نے گلگت میں ایک درزی کے ہاں نئی وردی بھی سلنے کے لئے دی لیکن اس کے سلنے کا انتظار نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنے یونٹ کے ایک این سی او کو درزی سے متعارف کروایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ وردی آگے بھجوا دیں۔ انہیں یہ وردی پہننے کا موقع نہیں ملا۔

گلگت سے انہوں نے ایک جیپ پکڑی اور ۲۳ جون کو اپنے والدین سے ملنے پرشنگ روانہ ہو گئے جو ان کے راستے ہی میں تھا۔ بونجی سے استور جاتے ہوئے ان کی اپنے بہنوئی رقیب احمد سے ملاقات ہوئی جو آرمی پبلک سکول میں پڑھاتے تھے اور چھٹی کے بعد اپنے گھر جا رہے تھے۔ میجر عبدالوہاب نے انہیں اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ شنگروٹ میں رقیب اتر گئے اور میجر وہاب کو گھر چلنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے نرمی سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ پہلے والدین سے مل لیں۔ واپسی پر ان سے ملاقات کے لئے گھر آئیں گے۔ انہوں نے اپنی ہمشیرہ آسیہ کو سلام بھجوایا۔ والدین سے ملاقات اور ان کی دعائیں لے کر وہ تقریباً نو بجے واپس آئے۔ ہارن کی آواز سن کر رقیب باہر آئے اور میجر وہاب کو گھر کے اندر لے گئے۔ گفتگو کے دوران میجر وہاب نے اپنی بہن آسیہ اور بہنوئی رقیب سے درخواست کی کہ وہ ان کی شہادت کے لئے دعا کریں۔ رقیب نے انہیں یاد دلایا کہ ان کے پانچ چھوٹے بچے ہیں اس لئے وہ یہ دعا کریں گے کہ وہ غازی بن کر لوٹیں۔ میجر وہاب ہنسے اور بولے ”چلیں دیکھتے ہیں کون اللہ کو زیادہ محبوب ہے اگر میں محبوب ہوں تو مجھے شہادت نصیب ہو گی اور اگر آپ محبوب ہیں تو آپ کی دعا قبول ہو گی اور میں غازی بن کر لوٹ آؤں گا۔“ اپنی بہن کے گھر سے وہ اپنے سسر مولوی یقین شاہ سے ملنے ان کے گھر گئے۔ وہ استور کی جامع مسجد میں خطیب تھے۔ وہاں انہوں نے وضو کر کے عشاء کی نماز پڑھی اور اپنے میزبان سے درخواست کی کہ وہ ان کی شہادت کے لئے دعا کریں۔

استور میں بہت سے لوگ ان کے منتظر تھے۔ وہ سب ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے لئے بے تاب تھے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ نہ جائیں لیکن کسی نے ان کی بات نہ مانی۔ تقریباً اسی افراد اپنی گاڑیوں میں درۂ برزل تک ان کے ساتھ گئے۔ ان کے ساتھ راشن بھی تھا اور فوجی بھائیوں کے لئے خشک میوہ جات کے تیس کلو کے پیکٹ۔ درۂ برزل سے انہیں زبردستی واپس بھیجا گیا کہ

تربیت کے بغیر انہیں جنگ میں نہیں جھونکا جا سکتا تھا۔ کئی افراد نے اصرار کیا کہ ان کے لئے مختصر مدت کی تربیت کا اہتمام کر کے بازو آزمانے کو موقع دیا جائے اور جہاں مناسب سمجھا جائے انہیں تعینات کر دیا جائے لیکن انہیں واپس بھیج دیا گیا۔

میجر عبدالوہاب نے ۲۴ جون کو ۶ این ایل آئی کے بٹالین ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کی۔ کمانڈنگ آفیسر نے انہیں آرام کرنے اور موسم سے مطابقت اختیار کرنے کو کہا لیکن وہ آگے جانے کے لئے بے تاب تھے۔ ایک دن کے بعد انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی اور طارق چوکی کا چارج سنبھالنے کو کہا گیا۔

طارق چوکی قومی اور بین الاقوامی پریس میں ٹائیگر ہلز کے نام سے مشہور ہوئی۔ میجر وہاب کی آمد سے پہلے چوکی کی کمان لیفٹیننٹ جاوید ساہی کے ہاتھ میں تھی جن کا تعلق بھی ایک بلوچ رجمنٹ، ۱۹ بلوچ سے تھا۔ انہوں نے ۳۰ مئی کو بنیال میں بٹالین ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر کرنل منصور سے علیک سلیک اور سیکنڈ ان کمانڈ میجر فاروق کی طرف سے پندرہ منٹ کی بریفنگ کے بعد انہیں عظمت چوکی پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں دو دن موسم سے مطابقت کے لئے قیام کے بعد وہ دو جون کو طارق چوکی پہنچے تھے۔

انہوں نے کیپٹن اقبال کی جگہ لی تھی جو دو دنوں بعد بٹالین ہیڈکوارٹر چلے گئے۔ لیفٹیننٹ جاوید نے دیکھا کہ وہاں صرف دو بنکر تھے۔ انہوں نے نئے بنکر کھودنے کا حکم دیا۔ سب لوگ اس کام میں جت گئے۔ کھدائی ۱۶ جون تک جاری رہی لیکن چونکہ دفاعی ساز و سامان میسر نہ تھا، وہ آرٹلری کی شیلنگ اور ہوائی حملوں سے بچاؤ کے لئے کوئی سائبان تعمیر نہ کر سکے۔ ۱۷ جون کو کمانڈنگ آفیسر نے ایمونیشن کی صورت حال جاننا چاہی۔ انہیں بتایا گیا کہ لائٹ مشین گنوں کے چودہ ہزار راؤنڈ، مشین گنوں کے چھ ہزار راؤنڈ اور جی تھری رائفلوں کی صرف دو سو گولیاں تھیں۔ زیادہ تر افراد کے پاس صرف جی تھری رائفلیں ہونے کی وجہ سے یہ تعداد بہت کم تھی۔

کمانڈنگ آفیسر نے وعدہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں انہیں مزید اسلحہ بھجوانے کی کوشش کریں گے۔ افرادی قوت کی خاصی کمی تھی۔ بار بردار افراد (پورٹر) میسر نہیں تھے۔ فوجیوں کو اپنا اسلحہ خود ہی لے جانا پڑتا تھا اور وہ بھی دفاعی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ کمانڈنگ آفیسر کا وعدہ ابھی ایفانہ ہوا تھا جب دشمن نے ۱۹ جون کو طارق چوکی پر حملہ کر دیا۔ لفٹیننٹ جاوید نے اپنے توپخانے سے پوائنٹ ۴۲۹۵ اور پوائنٹ ۴۲۸۲ پر گولہ باری کرنے کو کہا۔ توپخانے کی فوری کاروائی کی وجہ سے حملہ پسپا ہو گیا۔ آدھی رات تک تمام سوخاموشی چھا گئی۔ ۲۳ جون کو دشمن نے دوبارہ حملہ کیا۔ جاوید اور ان کے ساتھیوں نے توپخانے کی گولہ باری کے ساتھ ساتھ بہادری سے مقابلہ کیا اور یہ حملہ بھی ناکام بنا دیا گیا۔ ۲۴ جون کو مزید افراد وہاں پہنچ گئے اور ان کی تعداد ۲۰ سے بڑھ کر ۳۴ ہو گئی۔ نئے افراد جی تھری رائفلوں کے لئے سترہ ہزار گولیاں لے کر آئے تھے۔ میجر وہاب ۲۶ جون کی رات کو ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچے۔

میجر وہاب نے طارق چوکی پر پہنچ کر جو پہلی ہدایت جاری کی یہ تھی کہ سب لوگ نماز با جماعت ادا کریں گے۔ لیفٹیننٹ جاوید اور ان کے ساتھی بھی نمازیں پڑھتے تو تھے لیکن انفرادی طور پر۔ جسے جہاں وقت ملا، پڑھ لی لیکن میجر وہاب کے آنے کے بعد باقاعدہ اذان ہوتی اور سب لوگ مل کر باجماعت نماز ادا کرتے۔ اس دوران صرف دو سنتری پہرے پر ہوتے۔ میجر وہاب نے لیفٹیننٹ جاوید سے علاقے اور اس کے دفاع کے لئے جو اقدامات کیے گئے تھے، کے بارے میں بریفنگ لی۔ طارق چوکی کے آگے تین مشاہداتی چوکیاں تھیں۔ ایک مشاہداتی چوکی پیچھے کی طرف واقع تھی جو خاصی بلندی پر تھی اور وہاں سے پوائنٹ ۴۲۹۵ اور پوائنٹ ۴۲۸۲ پر ہونے والی دشمن کی سرگرمیاں صاف نظر آتی تھیں۔ ان کے پیچھے شمال مشرق میں غلام جان چوکی تھی جسے میجر عاصم کمان کر رہے تھے۔ طارق چوکی کی بلندی ۴۶۸۳ میٹر تھی۔ ہیڈ کوارٹر تقریباً وسط میں واقع تھا اور یہاں دو مشین گنیں نصب کی گئی تھیں۔ میجر وہاب

اور لیفٹیننٹ جاوید چاروں طرف گھومتے ہوئے باتیں کرتے رہے جبکہ اس دوران وقفے وقفے سے دشمن کے توپخانے کی گولہ باری جاری رہی۔ صبح ساڑھے چار بجے میجر وہاب نے کمانڈنگ آفیسر سے بات کی اور انہیں بتایا کہ انہوں نے چارج سنبھال لیا ہے۔ چونکہ کوئی سائبان میسر نہیں تھا، تو میجر وہاب نے متعلقہ دفاعی سامان بھجوانے کی درخواست بھی کی۔

دوسرے دن ہی سی جی آئی شیٹس آ گئیں۔ سب لوگ بنکروں کو مضبوط کرنے اور ان پر سائبان بنانے میں مصروف ہو گئے۔ میجر وہاب نے ایک جانب ایک مزید بنکر کی ضرورت محسوس کی۔ اس کا احساس لیفٹیننٹ جاوید کو بھی تھا اور انہوں نے وہاں نشان لگا کر کھدائی کی بھی تھی لیکن پھر اس کام کو ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔ میجر وہاب کے آنے کے بعد کی بات ہے۔ ۲۷ جون کو دشمن کے توپخانے کا ایک گولہ ٹھیک وہاں آ کر گرا جہاں کھدائی کیلئے نشان لگائے گئے تھے۔ اس سے اچھا خاصا گڑھا پیدا ہو گیا اور جو کام جوانوں نے سخت محنت سے کرنا تھا، دشمن کے ایک گولے نے پورا کر دیا۔ اب ان کا کام اس قدر رہ گیا تھا کہ وہ کونوں کی چھلائی کر کے خوبصورتی پیدا کریں۔ انہوں نے ہنستے ہوئے یہ کام مکمل کر لیا۔

۲۸ جون کی شام تک انہوں نے بنکروں پر کام مکمل کر لیا تھا۔ شام کو کمانڈنگ آفیسر نے اطلاع دی کہ دشمن کے کچھ پیغامات سنے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی دفاعی پوزیشن پر زبردست حملہ ہونے والا ہے۔ ان کی اطلاع درست ثابت ہوئی۔ فون پر گفتگو ختم ہوئی ہی تھی کہ دشمن کی گولہ باری شروع ہو گئی۔ اور اس کے بعد دشمن کی انفنٹری کے دستے حملے کے لئے آگے بڑھے۔ لیفٹیننٹ جاوید آگے ایک مشاہداتی چوکی پر تھے اور نائٹ گاگلز کے ذریعے انہوں نے دیکھا کہ دشمن کے دستے چوڑائی میں پھیلے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیفٹیننٹ جاوید ان کی پیش قدمی کے بارے میں کمنٹری نشر کر رہے تھے جبکہ میجر وہاب نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کر رکھی

تھی کہ وہ اسلحہ ضائع نہ کریں اور ان کی ہدایات کا انتظار کریں۔

میجر وہاب نے اس وقت فائرنگ کی جب دیکھا کہ دشمن کے سپاہی ان کے چھوٹے ہتھیاروں کی زد میں آگئے ہیں۔ ان کے ساتھیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ یہ فائرنگ ظاہر ہے کہ موثر ثابت ہوئی۔ دشمن کے کئی سپاہی فوراً لقمہ اجل ہوئے، باقی لوگوں نے جان بچا کر بھاگنے کو ترجیح دی۔ حملہ پسپا ہو گیا لیکن لیفٹیننٹ جاوید سمیت اپنے کئی لوگ بھی زخمی ہوئے۔ جاوید کو ایک گولی لگی تھی اور وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے میجر وہاب کو اپنے زخموں کی پٹی کرتے ہوئے پایا۔ ڈریسنگ مکمل کر کے میجر وہاب نے خود وہ جگہ سنبھال لی جہاں سے لیفٹیننٹ جاوید دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ جاوید نے آدھ ایک گھنٹہ تک آرام کیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے انہیں کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور ان پر غنودگی طاری تھی۔ اسی حالت میں چوکی کے ہیڈ کوارٹر سے ایک سپاہی نے آکر اطلاع دی کہ صوبیدار محمد حسین کو بم کا ایک ٹکڑا لگا ہے اور وہ زخمی ہیں۔ لیفٹیننٹ جاوید ہیڈ کوارٹر آئے تو دیکھا کہ صوبیدار محمد حسین کی مرہم پٹی وغیرہ کی جا چکی ہے۔ میجر وہاب بھی موجود تھے۔ لیفٹیننٹ جاوید کا خون بہنا بند نہیں ہوا تھا اور ان پر غنودگی طاری تھی۔ میجر وہاب نے ان دونوں کو ہدایت کی کہ وہ پیچھے چلے جائیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ میجر وہاب نے انہیں سمجھایا کہ ابھی زخم تازہ ہیں اور وہ چل بھی سکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نقاہت بڑھتی جائے گی اور وہ دوسروں پر بوجھ بن جائیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ وہ واپس چلے جائیں۔ جب خون رک جائے اور طبیعت قدرے بہتر ہو تو واپس آجائیں۔ دونوں قائل ہو گئے اور واپس جانے کے لئے تیار۔ ایک اور سپاہی جس کے پیٹ میں شدید درد تھا، ان کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں انہیں دشمن کے چند سپاہی ایک نالے سے اوپر چڑھتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے ان پر فائرنگ کی لیکن یہ کوشش لیفٹیننٹ جاوید کے لئے اچھی خاصی مشقت ثابت

ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ انہیں ہوش آیا تو صوبیدار محمد حسین انہیں پانی پلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے چلنا شروع کر دیا۔ نقاہت کی وجہ سے ہر دس منٹ بعد ان کا سانس پھول جاتا اور ستانے کیلئے انہیں رکنا پڑتا۔ ساری رات کے سفر کے بعد صبحدم وہ ریر ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔

طارق چوکی پر میجر وہاب کے ساتھ ایک سپاہی طیب رہ گیا تھا۔ دونوں نے دشمن کی پیش قدمی کو اس وقت تک روکے رکھا جب تک ان کے اردگرد کی چوکیوں کے تمام زخمی بحفاظت واپس نہیں چلے گئے۔ رات کو دشمن نے ایک اور حملہ کیا جس کے دوران میجر وہاب کے سینے پر ایک گولی لگی اور جسم کو چھیدتے ہوئے کمر کی طرف سے پار نکل گئی۔ جب انہیں اپنی زندگی کا بھروسہ نہ رہا تو انہوں نے اپنی گھڑی، قرآن اور دعاؤں کی ایک کتاب سپاہی طیب کے حوالے کی اور اسے واپس جانے کو کہا۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور ان کے ساتھ ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ اسی دوران دشمن کے سپاہی اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور نعرے لگاتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود میجر وہاب نے ایک مشین گن اٹھائی اور ان پر فائر کھول دیا۔ سپاہی طیب نے بھی فائر کیا اور دشمن کے سارے سپاہی ڈھیر ہو گئے۔ سپاہی طیب ۲۹ جون کی صبح تک میجر وہاب کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ انہوں نے اشاروں سے فجر کی نماز پڑھی جس کے بعد ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ شہادت کی تمنا پوری ہو گئی۔ سپاہی طیب نے اپنے کوٹ سے ان کے جسد خاکی کو ڈھانپا اور بوجھل دل کے ساتھ واپس چل پڑا۔ سات گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ یونٹ کے ریر ہیڈ کوارٹر میں پہنچا۔ میجر وہاب نے اپنی بیوہ کے علاوہ پانچ بچے صلاح الدین، زاہدہ حنا، جمال الدین، جلال الدین اور عماد الدین پیچھے چھوڑے۔ بعد ازاں انہیں ستارۂ جرات سے نوازا گیا۔

گلاب کی خوشبو

حیدرآباد کی عیدگاہ، رانی باغ میں اکثر ایک سانولا سلونا لڑکا کرکٹ کھیلتا نظر آتا۔ اس کے بھانجے بھتیجے، لطیف آباد یونٹ نمبر پانچ کے ہم عمر ساتھی، ساتھ ہوتے۔ وہ خود لیفٹ ہینڈ بیٹسمین تھا اور لیفٹ ہینڈ فاسٹ بالر۔ بیٹ سنبھالتا تو اسے آؤٹ کرنا مشکل ہو جاتا۔ جب سب بالنگ اور فیلڈنگ کر کے تھک جاتے تو درخواست کی جاتی کہ وہ ریٹائر ہو جائے۔ تب وہ بالنگ سنبھال لیتا۔ پہلے جان بوجھ کر ایسی بالنگ کراتا کہ کھیلنے والے آسانی سے کھیل سکیں۔ پھر چیلنج کرتا کہ لو بھئی سنبھل جاؤ اور دوسری تیسری بال پر آؤٹ کر دیتا۔

پھر یوں ہوا کہ یہ لڑکا فوج میں چلا گیا۔ پورا محلہ اداس تھا۔ پی ایم اے کی بھٹی سے تپ کر نکلا تو اس کا رنگ اور سانولا ہو گیا تھا لیکن صلاحیتیں نکھر آئی تھیں۔ مطالعے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ بچپن کی ضد اور غصہ کم ہو گیا تھا۔ اب وہ گھر آتا تو زیادہ تر وقت والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزارتا۔ دوستوں کے اصرار پر کھیلنے بھی جاتا، محلے داروں سے بھی ملتا لیکن زیادہ تر وقت والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزارتا۔ یہ ایک سلجھا ہوا گھرانہ ہے۔ نہایت ہی نفیس لوگوں پر مشتمل۔ شیر محمد دھاریوال اس کنبے کے سربراہ ہیں۔ انتہائی متوازن، باحوصلہ اور صبر و تحمل کی منہ بولتی تصویر۔ ان کا ابتدائی

تعلق پٹیالے سے تھا۔ ۱۹۴۷ء میں والدین کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئے تو ان کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری سے بی ایس سی آنرز کیا۔اور شوگر انڈسٹری میں بطور کیمسٹ ملازمت اختیار کی۔ آج کل فائبر ٹیکس کوٹری میں سروس کرتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ابھی انہوں نے میٹرک ہی کیا تھا کہ والدین نے شادی کر دی۔

اب معلوم نہیں یہ شوگر انڈسٹری سے وابستگی کا اعجاز تھا یا ان کی شخصیت کا کمال کہ ان کے سب بچے شیریں مقال ہیں۔ گفتگو میں حلاوت، "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" کردار کے عظیم لوگ، ایثار اور قربانیوں کے پیکر، مشترکہ فیملی میں سب کا ساتھ نباہنے، سب کو ساتھ لے کر چلنے والے لوگ۔ جس لڑکے کا ہم شروع میں ذکر کر رہے تھے۔ وہ تھا ان کا چوتھا بیٹا عبدالمالک۔

پاکستان کے وجود میں آنے والے مہینے کی آٹھ تاریخ تھی، سال ۱۹۷۴ء، جب وہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت سے ہی ان کا رنگ سانولا تھا۔ بڑی بہن منور سلطانہ نے جو اس وقت چھ سال کی تھیں، جب اسے پہلی بار دیکھا تو حیرت سے بولی: "امی بھائی کا رنگ نیلا ہے"۔ اسے بہتیرا سمجھایا گیا کہ رنگ نیلا نہیں ہے لیکن وہ اسے نیلا کہنے پر اصرار کرتی رہی اور جب بہن بھائی بڑے ہو گئے تب بھی معصوم حیرتوں میں پکارا گیا نام باقی رہا اور وہ اسے نیلا کہہ کر بلاتی رہیں۔ والدہ اور تائی اماں اسے بھولا کہتی تھیں۔ بڑے ہو کر فوج میں گئے تو یونٹ کے افسر پیار سے مالکی کہہ کر بلاتے۔ باقی لوگ مالک کہتے تھے۔

مالک نے جب گھٹنوں کے بل چلنا شروع کیا تو گھر میں ایک طوفان آ گیا۔ کوئی چیز اس کی دست برد سے محفوظ نہیں تھی۔ وہ ہر چیز کا تجزیہ کرنا چاہتا۔ کتنے ہی کھلونے، ڈیکوریشن پیس، سنگھار میز کی چیزیں اس کے تجزیوں کی نذر ہو گئیں۔ باقی چیزوں کی تو خیر تھی۔ ایک دن اس کے ہاتھ میں صابن آ گیا۔ اسے دیکھا سونگھا، کچھ

سمجھ نہ آئی کہ کیا ہے اس نے چکھا، شاید مزیدار لگا کہ وہ کھاتا چلا گیا۔ تائی اماں نے دیکھا تو صابن چھینا، منہ دھلوایا اور دیورانی کو جھاڑ پلائی کہ تم سے ایک بچہ نہیں سنبھالا جاتا۔ اس بچے کو سنبھالنا تھا ہی بڑا مشکل۔ ذرا نظر بچتی اور وہ گھر کا جائزہ لینے نکل پڑتا۔ صابن اس کی پسندیدہ "ڈش" تھی۔ ایک دن اسے پیٹ بھر کے صابن کھانے کا موقع ملا۔ طبیعت بگڑ گئی۔ تائی اماں نے دیورانی کو خوب صلوتیں سنائیں۔ اور بھولے کو گود میں لئے ڈاکٹروں کے ہاں چکر کاٹتی رہیں۔ بڑی مشکلوں سے طبیعت سنبھلی۔ بہن کا "نیلا" ماں اور تائی اماں کا "بھولا" فوج کا "مالکی" اور باقی لوگوں کا "مالک" ملنسار، خوش اخلاق، ہنستا مسکراتا نوجوان تھا۔ ٹوٹ کر محبتیں کرنے والا۔ ضدی بھی تھا۔ ہٹ کا پکا، اپنی بات منوا کر چھوڑتا۔ طبیعت میں غصہ بھی بہت تھا۔ شروع شروع میں تو غصہ ناک پر دھرا رہتا۔ کسی کی بدتمیزی اس سے ذرا برداشت نہ ہوتی۔ اس لئے محلے میں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے۔ لوگ گھر پر شکایت لے کر آتے۔ والد صاحب ڈانٹتے اور معافی مانگنے کو کہتے تو والد کے احترام میں معافی مانگ لیتا لیکن پھر کسی کونے میں کھڑا ہچکیاں بھرتا رہتا۔ ابو چمکارتے تو پھٹ پڑتا کہ آپ نے اس کی بدتمیزی تو دیکھی نہیں مجھ سے معافی منگوائی۔ وہ سمجھاتے "کوئی بات نہیں بیٹے، غلطی پر معافی مانگنے میں عظمت ہے"۔ "میں نے غلطی کب کی تھی۔ آپ نے غیر قانونی معافی منگوائی ہے"۔ "بلے بھئی تیرے قانون دان کے"، ابو ہنس پڑتے، سوچتے، بڑا ہو کر قانون دان بنے گا۔

ذہانت اور شرارت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مالک ذہین بھی تھا، شرارتی بھی۔ ایک دفعہ رات کے وقت والد صاحب کی چوگوشی ٹوپی پہنی، چہرے پر توے کی کالک ملی، دانتوں میں لہسن کی جویں پھنسائیں اور ہاتھوں کو ٹیڑھا کر کے ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ چھوٹی بہن سعدیہ گزری تو "آدم بو آدم بو" کہہ کر اسے ڈرا دیا۔ وہ چیخ مار کر بھاگی۔ باقی بہنیں آئیں۔ پہلے تو ڈر گئیں۔ پھر سب نے مل کر خوب پٹائی

کی۔ مالک ہنستا رہا۔

ایک دن بھائی بہن پٹاخے چلا رہے تھے۔ مالک پٹاخہ پھینکنے کو تھے کہ بڑی بہن کشور نے چھین لیا کہ میں چلاؤں گی۔ جھنجھلا کر بولا" اللہ کرے تیرا پٹاخہ ٹھس ہوجائے"۔

کشور نے چلایا۔ ٹھس ہوگیا۔ خوش ہو کر تالیاں بجاتا رہا۔

ہائی سکول میں داخلے کا وقت آیا تو والد نے ایک انگلش میڈیم سکول میں داخل کروانا چاہا۔ لیکن وہ بولا کہ ابو آپ کی ساری تنخواہ تو فیسوں میں چلی جایا کرے گی، گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ انہوں نے کہا بھی کہ میں اوور ٹائم کام کیا کروں گا تو پیسوں کی فکر نہ کر لیکن مالک نے انکار کر دیا اور علامہ اقبال ہائی سکول لطیف آباد میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ۱۹۹۰ء میں اے گریڈ میں میٹرک کیا۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے والد نے بچوں کی دینی تربیت کا بھی اہتمام کیا۔ لطیف آباد میں ایک چھوٹی سی رحمانیہ مسجد ہے جس کے خطیب رب نواز صاحب حافظ بھی ہیں قاری بھی۔ عبد المالک، عبدالماجد اور دونوں چھوٹی بہنیں قرآن شریف پڑھنے ان کے پاس جایا کرتیں۔ وہ خوش الحانی سے تلاوت کرتے تو سننے والے وجد میں آجاتے۔ کیپٹن مالک نے انہی سے متاثر ہو کر قرأت بھی توجہ سے سیکھی اور خود بھی بڑی خوش الحانی سے تلاوت کرنے لگے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ایک مرتبہ قرأت کے مقابلے ہوئے تو انہوں نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔

سکول کے دنوں ہی کی بات ہے کہ ایک دفعہ سب گھر والے تفریح کے لئے کراچی گئے۔ کلفٹن کے جھولوں میں کشتی پر بیٹھ گئے۔ جب کشتی ہوا میں بلند ہوتی ہے تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ اچھے بھلے لوگ گھگھیانے لگتے ہیں۔ مالک تو چھوٹا سا تھا۔ رونے لگا اور زور زور سے پکارا: "امی! امی!"۔ بڑے بھائی عبدالخالق نے ہنستے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اور چپ کروایا۔ یہ بچپن کی بات ہے۔ بڑا

ہو کر فوج میں گیا تو اس نے پیراجمپ کورس کیا۔ بچپن میں چند فٹ کی بلندیوں سے ڈرنے والا مالک سینکڑوں فٹ کی بلندیوں پر اڑتا پھرتا تھا، اور مزید بلندیوں کا متلاشی رہتا تھا، بلندیاں اس کا مقدر تھیں۔ بلندیوں کے مسکن، بلندیوں کی جنگ، بلندئ خیال، بلندئ کردار اور درجات رفیعہ۔

خوشبوؤں کا شیدائی تھا، اعتدال کے ساتھ۔ اس کے پاس ہر وقت تین چار قسم کی خوشبوئیں موجود رہتیں، سفر میں بھی ایک آدھ کلون ساتھ رکھتا، گلاب کی خوشبو بہت پسند تھی، تازہ کھلے ہوئے گلاب اچھے لگتے۔

تجھے گلاب کے پھولوں سے یوں بھی الفت تھی
کہ ان میں آتی تھی خوشبو ترے بدن کی سی

عبد المالک کو میٹھا کھانے کا بڑا شوق تھا۔ کھیر کا دشمن، سویّوں کا رسیا، آموں کا شیدائی، آئسکریم کا دیوانہ، مٹھاس کسی بھی شکل میں ہوتی اسے اچھی لگتی۔ والدہ اپنے بھائی سے ملنے شورکوٹ جایا کرتیں تو فرمائش کرتا" امی ماموں سے گڑ لے کر آنا" گڑ آجاتا تو ڈلیوں کی ڈلیاں پھانک جاتا۔ گڑ والے چاول پکواتا، سویاں اتنے شوق سے کھاتا کہ والدہ کہا کرتیں کہ تیری شادی میں سویوں کی دیگ ہی پکواؤں گی۔ ہنس کر کہتا ضرور ضرور، ہم وہی پکوائیں گے جو ہمارا دل کرے گا۔ مہمانوں کی مرضی کھائیں نہ کھائیں۔ تائی اماں کہتیں کہ اگر مہمانوں نے کھیر نہ کھائی تو؟ سینے پر ہاتھ مار کر کہتا "آپ کا یہ بیٹا کس دن کام آئے گا۔ حاضر اماں حاضر"۔

گھر میں کھیر پکتی تو اس سے انتظار نہ ہوتا۔ گرم گرم ہی کھانا شروع کر دیتا۔ ایک مرتبہ کھیر پکی تو برتنوں میں ڈالی گئی کہ فریج میں رکھی جائے، ٹھنڈی ہونے کے لئے۔ والدہ نے دیگچی اس کے آگے رکھ دی کہ لو اسے چاٹ لو۔ محض دیگچی چاٹنے سے کہاں گزارہ ہوتا تھا۔ بولا "نہیں، میں نہیں چاٹتا دیگچی۔ میری شادی پر بارش ہوگی"۔

ایک پوری پلیٹ اٹھا کر یہ جا وہ جا۔

بہنیں بتاتی ہیں کہ اس کی شادی پہ بارش نہیں ہوئی، موسم خوشگوار رہا۔

ایک دفعہ گھر میں آم آئے۔ دوپہر کے کھانے پر جی بھر کے کھائے گئے۔ جو بچ گئے فریج میں رکھ دیے گئے۔ گھر کے بھی افراد آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ مالک کوئی کتاب اُٹھائے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ رات کے کھانے کے بعد آم نکالنے کے لئے فریج کھولا گیا تو دیکھا سارے آم غائب۔ ڈھنڈیا پڑی تو مالک یہ کہتے ہوئے پائے گئے "جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے"۔ ایک مرتبہ چھوٹے بھائی عبدالماجد سے جانے کیا غلطی ہوئی۔ اس کی سزا یہ قرار پائی کہ وہ شام کو سب گھر والوں کو آئس کریم کھلائے گا۔ وہ سب گھر والوں میں قدرے "کفایت شعار" مشہور ہے۔ اور اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں وہ مکر نہ جائے یا عین وقت پر گھر سے غائب نہ ہو جائے۔ لیکن مالک نے اسے باکسنگ کی زد پر رکھ کر اس سے باقاعدہ حلف لیا" میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج شام کو سب گھر والوں کو آئس کریم کھلاؤں گا"۔ مالک عبارت پڑھتے جاتے ماجد دہراتا، بہنیں ہنس ہنس کر دہری ہوئی جاتی تھیں۔ چھوٹی بہن سعدیہ حلف سے بھی مطمئن نہ ہوئی اور اس نے تجویز پیش کی کہ معاہدے کو باقاعدہ تحریری شکل دی جائے" بالکل ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے" مالک نے ماجد پر باکسنگ کی پریکٹس جاری رکھتے ہوئے فیصلہ صادر کیا اور بہنوں سے کہا کہ جلدی سے کاغذ قلم کا بندوبست کر دیں۔ سعدیہ نے دیوار پر لگا ایک ڈیکوریشن پیس اتارا اور اسے الٹا کر کے ماجد کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے حلف کی عبارت لکھی، نیچے دستخط فرمائے۔ گواہوں کے طور پر عبد المالک اور دونوں بہنوں نادیہ اور سعدیہ نے بھی دستخط کیے۔ شام کو سب نے آئس کریم اڑائی۔ شرارتیں اپنی جگہ، بہن بھائیوں میں مثالی پیار تھا۔ ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کا باہر نکلنا مشکل ہوتا ہے چنانچہ سب سے چھوٹے بھائی عبدالماجد نے بہنوں کے لئے ٹیبل ٹینس کی میز بنوا کر گھر میں رکھوا دی تھی کہ ایکسرسائز کا موقع ملتا رہے۔ مالک کو جب فرصت ملتی وہ بہنوں کو باہر لے

جاتے۔ شاپنگ کرواتے اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے۔ سب سے چھوٹی بہن سعدیہ سیکنڈ ائر میں آئی تو ایک دن مالک سے کہنے لگی کہ میری خواہش ہے کہ اے ون گریڈ لوں۔ "تو مشکل کیا ہے محنت کرو پڑھا کرو" چھٹی پر آئے مالک نے سادہ سا حل تجویز کر دیا تو سعدیہ نے بتایا کہ مشکل یہ ہے کہ پڑھانے والا کوئی نہیں۔ تب کیپٹن مالک نے بہن کو پڑھانے کا بیڑا اُٹھایا۔ روزانہ باقاعدگی سے اسے پڑھاتے۔ ایک مہینے کی ٹیوشن نے ہی سعدیہ کی ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ اخوت و محبت کے لطیف احساسات میں بھیگا ہوا یہ گھرانہ پوری قوم کے لئے قابل تقلید ہے۔ دنیا سے لگاؤ بس اتنا جیسے دور منزل کا راہی ستانے کے لئے کہیں ٹھہر جائے۔ دین کا گہرا شعور اور قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور۔

شیر محمد صاحب کے سات بچے ہیں۔ تین بیٹے عبد الخالق، عبد المالک، اور عبدالماجد، چار بیٹیاں، منور سلطانہ، کشور سلطانہ، نادیہ اور سعدیہ۔ بڑی دونوں بیٹیاں شادی کے بعد اپنے گھر کو سدھار گئیں۔ چھوٹی دو، زیر تعلیم ہیں۔ تینوں بیٹے شہادت کی آرزو میں جان ہتھیلی پہ لئے پھرتے تھے۔ عبدالخالق کئی برسوں تک افغانستان میں مجاہدین کے ساتھ رہے۔ کارگل آپریشن میں وہ گلتری کے آس پاس مصروف جہاد تھے جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔ شیر محمد صاحب خوش قسمت ہیں کہ بچوں کو جو دلہنیں ملیں انتہائی سگھڑ، سلیقہ شعار، دین کا فہم رکھنے والیاں۔ بڑی بہو عبدالخالق کی بیگم رابعہ چھ بہنوں میں سے ایک ہیں۔ ان کا ایک ہی بھائی تھا۔ جاوید ستار، وہ بھی شہادت کے جذبے سے سرشار۔ دین کا فہم اور پاکستان سے محبت انہیں ورثے میں ملی۔ ان کے والد اقبال ستار گیارہ سال کے تھے جب پاکستان بنا۔ حیدرآباد دکن سے وہ اکیلے ہجرت کر کے ایک قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچے۔ جن لوگوں نے ہجرت کی صعوبتیں اٹھائی ہیں ان کے دل میں پاکستان اور اسلام کہ جس کے نام پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا، رچا بسا رہتا ہے۔ اور یہی محبت وہ اپنی اولاد میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ تو ان کا

اکلوتا بیٹا بھی اسلام اور پاکستان کی محبت سے سرشار تھا۔ چھ بہنوں کا یہ بھائی شہادت کی آرزو میں افغانستان جا پہنچا اور بے جگری سے لڑتا ہوا خوست کے محاذ پر شہید ہوا۔ رابعہ جب بہو بن کر اس گھر میں آئیں تو عبدالمالک اور عبدالماجد نے انہیں اتنا احترام اور پیار دیا کہ انہیں بھائی کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

جب عبدالمالک کو آئی ایس ایس بی کی کال آئی تو وہ افغانستان میں خوست کے مقام پر لڑ رہے تھے۔ عبدالخالق پیچھے ایک تربیتی کیمپ کے انچارج تھے۔ انہیں اطلاع ملی تو انہوں نے عبدالمالک کو بلوا کر واپس بھیج دیا۔ فوج میں شامل ہونے کا شوق تو تینوں بھائیوں ہی کو تھا۔ فوج میں کمیشن کے لئے درخواست دینے سے بہت پہلے عبدالمالک نے پاک بحریہ میں شمولیت کے لئے بھی درخواست دی تھی۔ سکھر میں ابتدائی امتحان اور انٹرویو کے بعد آئی ایس ایس بی کی کال آئی تو ان کے گھٹنے میں پھوڑا نکلا ہوا تھا اور چلنے پھرنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ والد صاحب اور بڑے بھائی نے سمجھایا بھی کہ اس حالت میں نہ جاؤ لیکن دھن کا پکا تھا۔ بحریہ میں تو انہیں کامیابی نہ ہو سکی لیکن دوسری بار کامیابی ان کا مقدر ٹھہری اور اپریل ۱۹۹۳ء میں وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی پہنچ گئے۔

جب عبدالمالک پی ایم اے میں زیر تربیت تھے تو ان کے بڑے بھائی عبدالخالق پھر سے افغانستان پہنچے ہوئے تھے۔ اس بار وہ صوبہ پروان میں مصروف جہاد تھے۔ ایک حملے میں ان کے گیارہ ساتھی شہید ہوئے۔ وہ واحد شخص تھے جو زندہ بچے لیکن سخت زخمی۔ انہیں پشاور میں مجاہدین کے لئے قائم کردہ ایک ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ اس وقت مالک فائنل ٹرم میں پہنچ چکے تھے۔ اور انہیں ہر ہفتے ویک اینڈ پر چھٹی جانے کی سہولت حاصل تھی۔ وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے پشاور آتے اور بڑے بھائی کی خدمت میں مصروف رہتے۔ عبدالخالق چھوٹے بھائی کی عادت سے واقف تھے۔ وہ بڑے اہتمام سے آئس کریم منگوا کر فریج میں رکھا کرتے تھے۔ عبدالمالک

کا ہسپتال پہنچتے یہ پہلا سوال یہ ہوتا ''کہاں ہے میرا حصہ''۔ انہی دنوں انہیں عبدالخالق کے پاس راقم الحروف کی کتاب ''فاتح سبونہ'' نظر آئی۔ بہنیں بتاتی ہیں کہ جنٹلمین سیریز تو انہوں نے اور سب گھر والوں نے پہلے ہی پڑھ رکھی تھی۔ اور گھر میں ان کتابوں پر اکثر گفتگو رہتی لیکن ''فاتح سبونہ'' انہوں نے پشاور ہی میں بڑے بھائی کی عیادت کے دوران پڑھی اور تہیہ کیا کہ وہ بھی فرنٹیر فورس ہی میں جائیں گے۔ پی ایم اے میں تربیت کی تکمیل پر انہوں نے پہلی ترجیح میں انفنٹری، فرنٹیر فورس رجمنٹ ہی کا ذکر کیا اور خوش قسمتی سے ان کی بات مانتے ہوئے انہیں ۱۹ فرنٹیر فورس رجمنٹ میں تعینات کیا گیا۔

پاسنگ آؤٹ پر سب گھر والے پریڈ دیکھنے آئے۔ امی ابو بھائی بہنیں۔ عبدالمالک نے خود ان کا استقبال کیا اور مہمانوں کی گیلری کی طرف رہنمائی کے بعد پاسنگ آؤٹ پریڈ کے لئے چلے گئے۔ پریڈ کے بعد سب لوگ ان کے کمرے میں گئے کہ سب گھر والوں کو اشتیاق تھا کہ دیکھیں عبدالمالک نے تربیت کے ڈھائی سال کہاں گزارے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے۔

کمیشن ملنے پر انہیں جس یونٹ میں پوسٹ کیا گیا وہ اس وقت پشاور میں تھی۔ وہیں سے وہ انفنٹری کی بنیادی تربیت کے لئے سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ گئے پھر ایڈوانس ٹریننگ کے لئے سپیشل سروسز گروپ کے سنٹر چراٹ گئے۔ اسی تربیت کے دوران ہی انہوں نے پیراشوٹ جمپ کورس کیا۔ اسوقت تک ان کی یونٹ پشاور سے منگلا منتقل ہو چکی تھی۔ وہ واپس آئے تو انہیں یونٹ میں کوارٹر ماسٹر کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جولائی ۱۹۹۸ء میں انہوں نے کپتان کے عہدے پر ترقی پائی۔

کیپٹن مالک فوج میں کیا گئے فوج کے سفیر ہی ہو گئے۔ اب وہ چھٹی پر گھر آتے تو اپنے بھتیجوں، آفتاب انور اور ارسلان کو وہی ڈنڈ بیٹھکیں (پش اپ، سٹ اپ) نکلواتے جو وہ خود کرتے تھے۔ محلے کا کوئی بچہ آتا تو شوق سے اس کلاس میں

شامل ہو جاتا۔ اب وہ رانی باغ جاتے تو سب بچوں کی قطار بنا کر دوڑ لگواتے۔ انہیں سمجھاتے، فوج بڑا اچھا ادارہ ہے۔ بہادر لڑکوں کا اصل مقام فوج ہی ہے۔ امکان ہے کہ آنے والے دنوں میں فوج میں لطیف آباد کی نمائندگی بڑھ جائے گی کہ مالک سے ملنے والا ہر لڑکا انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فوج میں شمولیت کا خواہش مند ہوگا۔

کپتانی سے پہلے ہی گھر میں شادی کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ان کے والد شیر محمد صاحب شادی کی کسی تقریب میں سمہ سٹہ گئے تھے۔ وہاں انہیں ایک پیاری سی بچی ملی۔ معصوم سی بھولی بھالی سی۔ انہوں نے خواہش کی کہ کاش یہ بچی ان کے گھر کی رونق بنے۔ ادھر مالک میاں نے بھی تھوڑا عرصہ پہلے اسی لڑکی کو کسی تقریب میں دیکھا تو دعا کی کہ زندگی کے سفر میں اس کا ساتھ مل جائے۔ گھر میں گفتگو چلی اور اسی لڑکی پر آکر ٹھہر گئی۔ نام نازنین کوثر، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے گریجویشن کیا تھا۔ رشتے میں وہ دور پار سے عبدالمالک کی ماموں زاد ٹھہرتی ہیں۔ ان کے والدین کو پیام دیا گیا تو انہوں نے بخوشی رضامندی کا اظہار کیا۔ دین کا فہم رکھنے والے جماعت اسلامی کے دونوں گھرانے فضول رسم و رواج کے قائل تو تھے نہیں، اس لئے منگنی و نگنی کے چکر میں نہیں پڑے۔ زبانی قول و قرار ہی کو کافی سمجھا گیا۔ عبدالمالک کپتان ہوئے تو گھر والوں نے سوچا کہ اب مالک کی شادی کر دی جائے۔ ان سے بات ہوئی تو انہوں نے جھٹ ہاں کر دی۔ بولے کہ نیک کام میں دیر کیسی، کل کی کرتے آج کرو، بلکہ فون پر بات کرتے تو زور دیتے کہ لڑکی والوں سے تاریخ لے لو۔ لڑکی والوں کو سو جھنجھٹ ہوتے ہیں۔ والدہ سمجھاتیں کہ لے لیں گے تاریخ، تم چپ رہو۔ ایک دفعہ بولے کہ ماں لگتا ہے تم نے کوئی نہیں کرنی میری شادی، میں خود ہی نہ کرلوں۔ والدہ نے لاڈ سے سمجھایا کہ نا بیٹا نا۔ ایسی بدفالی زبان سے نہیں نکالتے۔ شادی خاندان میں کرنی ہے۔ اور اب تو میں زبان دے بیٹھی ہوں۔ مالک ہنس دیئے۔

ایک مرتبہ چھٹی پر گھر آئے تو دیکھا کہ ماں، تائی اماں اور بہنیں کپڑوں کی تیاری میں مصروف ہیں۔ جوڑوں پر کشیدہ کاری، دوپٹوں کی رنگائی، سلمیٰ ستارہ، مکیش، دبکا، لیس وغیرہ کا کام جاری تھا۔ تائی اماں سے کہنے لگے کہ میں سمہ سٹہ نہ ہو آؤں، دیکھ کر آؤں کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ سیدھی سادی تائی اماں نے سمجھایا کہ نا بیٹا نا جب بات پکی ہو جائے تو پھر لڑکی والوں کے گھر نہیں جاتے۔ بری بات، ایک بار جانا سہرا سجا کے۔ اور اگر یونٹ واپس جاتے ہوئے میں سمہ سٹہ اتر جاؤں تو آپ کو تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ عبدالمالک نے چھیڑا۔ "میں تمہاری ٹانگیں نہ توڑ دوں گی"۔ تائی اماں جلال میں آگئیں۔ عبدالمالک نے ہنستے ہوئے انہیں منایا۔ اسی دوران وہ بہنوں کے ساتھ بازار گئے۔ اور انہیں کپڑے دلوائے۔ والدہ کے لئے ایک خوبصورت سا جوڑا خرید کر لائے۔ ماں نے کہا بیٹا دلہن کے لئے کوئی جوڑا لے آتے۔ میرے لئے لانے کی کیا ضرورت تھی تو بولے کہ بہو کا کام آپ جانیں یا بہو۔ میرا کام تو آپکی خدمت ہے اور دوسرے یہ کہ اب آپ کپتان کی امی ہو گئی ہیں اچھے اچھے کپڑے پہنا کریں۔

چھٹی ختم ہوئی تو واپس چلے گئے۔ جاتے جاتے بھی تائی اماں سے نوک جھوک جاری رہی کہ سمہ سٹہ اتر کر جاؤں گا۔ ہونے والی دلہن تائی اماں کی بھتیجی بھی لگتی تھی۔ انہیں دونوں ہی عزیز تھے لیکن وہ مالک کو ڈانٹ پلاتیں کہ خبردار، ادھر کا رخ نہ کرنا۔ کیپٹن مالک واپس آئے تو پتہ چلا کہ یونٹ سول انتظامیہ کی مدد کے سلسلے میں چکوال پہنچی ہوئی ہے۔ واپڈا میں بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے۔ اس ادارے کے کلیدی عہدوں پر فوج کے جنرل تعینات کیے گئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ایک لاکھ اڑتیس ہزار افرادی قوت رکھنے والے اس ادارے کو دو تین افراد کہاں کنٹرول کر سکتے تھے۔ چنانچہ نچلی سطحوں پر نگرانی کے لئے ملک بھر سے آرمی یونٹ مختلف علاقوں میں متعین کیے گئے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ۹۸-۱۹۹۷ء میں جہاں اس ادارے کو تقریباً ڈیڑھ ارب روپے کا خسارہ ہوا تھا۔ ۹۹-۱۹۹۸ء میں وہ پونے تین ارب روپے

کا منافع کما رہا تھا۔ (روزنامہ ڈان، جنگ بزنس ریکارڈ، سینیٹ رپورٹ مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء) تو کیپٹن عبدالمالک اپنے یونٹ کے ساتھ مل کر چکوال میں واپڈا کی کارکردگی بہتر بنانے میں مصروف تھے۔

اور یہ کارگل آپریشن والے برس کا موسم بہار تھا جب کیپٹن مالک شادی کے لئے بیس دنوں کی چھٹی لے کر گھر آئے۔ شادی کی تاریخ ۷ اپریل مقرر ہوئی تھی۔ بہنوں نے سانولے بھیا کو گورا کرنے کے لئے ابٹن کا انتظام کر رکھا تھا۔

مالک خود شام کو چیخ چیخ کر نادیہ اور سعدیہ کو بلواتے کہ آؤ مجھے رنگ گورا کرنے والی کریم لگاؤ۔ میری گوری دلہن کہیں مجھے دیکھ کر ڈر ہی نہ جائے۔ ایک ہفتے تک ابٹن کی مالش بلا ناغہ جاری رہی۔ بارات کے لئے ۶ اپریل کو بہاؤالدین ذکریا ایکسپریس سے نشستیں مخصوص کروائی گئی تھیں۔ رات نو بجے حیدر آباد سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک خاتون سے جھڑپ بھی ہوئی جو بارات کے اتنے بہت سے مسافروں کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ اور باراتیوں کے لئے مخصوص نشستیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ بارات میں شامل بچوں نے بیٹ بال بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ کہ سمہ سٹہ میں شادی کی مصروفیات سے وقت بچا تو کرکٹ کھیلیں گے۔ یہ بیٹ کیپٹن مالک کے ہاتھ میں تھا۔ خاتون کی بدتمیزیاں بڑھیں تو غصے میں بولے کہ بیٹ مار کر سر کھول دونگا۔ والدہ نے سمجھایا کہ نا بھولے۔ ایسی بات نہیں کرتے۔ خاتون تنک کر بولی نام دیکھو ذرا بھولا اور غصہ ایسے جیسے محمد علی باکسر کا۔ خاتون کو تو یہ معلوم نہیں تھا کہ مالک بہت اچھا باکسر بھی تھا۔ بہنوں نے انہیں پکڑ کر بٹھایا کہ آپ تو مت بولیں دولہا بھی کہیں بولتے ہیں۔

صبح ساڑھے نو بجے یہ لوگ سمہ سٹہ سٹیشن اترے۔ ایک گھر میں بارات کو ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں ناشتہ کیا گیا۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر کے بارات لڑکی والوں کے ہاں پہنچی اور نکاح کے بعد دلہن کو لے کر اسی شام آٹھ بجے بہاؤا

لدین ذکریا ایکسپریس سے یہ لوگ واپس روانہ ہوئے۔ ۹ اپریل کو گھر میں تقریب ولیمہ منعقد ہوئی۔ مالک بیس دنوں کی چھٹی لے کر آئے تھے۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے آئے تھے باقی دن ہی کتنے بچے تھے۔ نازنین کوثر نے بہت کم وقت مالک کے ساتھ گزارا۔ لیکن وہ ان کی عظمت کردار کی قائل ہیں، اور پاکیزگی نظر کی گواہ۔ کہتی ہیں کہ دوسرے عورتوں کی طرف تو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ ایک دو محفلوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ شروع شروع کے دن تھے، ایک دوسرے کو پرکھنے، جاننے اور جانچنے کا مرحلہ! کہتی ہیں کہ میں مالک کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ ان کی نظریں بالعموم جھکی رہتی تھیں۔ ایک آدھ مرتبہ ان کی باہم نظریں چار بھی ہوئیں تو وہ ہنس دیئے۔ بعد میں پوچھا کہ آپ کیوں ہنس رہے تھے۔ تو الٹا انہوں نے پوچھا تم مجھے کیوں دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے نا کہ میں کہیں نظربازی میں مصروف تو نہیں، کوثر نے اعتراف کر لیا۔ اپنے آدمیاں پر شک کرنا شائد عورت کی فطرت ہے اور ہر عورت کے دل میں شک بھیر سانپ کی شکل میں رہتا ہے۔ شک یقین میں بدل جائے تو یہ سانپ بری سرح ٹھوکتا ہے اور زندگی میں زہر گھل جاتا ہے۔ لیکن مرد کی نظروں کی حفاظت، یہ شک نہیں کرتا خدا کا خوف ہی کرتا ہے اور مالک خدا ترس انسان تھے۔

شادی کے بعد کی بات ہے، کوثر نے مالک سے کہا کہ میری کچھ سہیلیاں آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ پہلے تو مالک نے انکار کر دیا لیکن ایک دو دنوں کے بعد کہنے لگے کہ اپنی سہیلیوں کو ملاقات کے لئے دعوت پر بلا لو۔ تبدیلی رائے کی وجہ پوچھی تو بولے کہ میں نے ایک حدیث شریف پڑھی ہے کہ رسول پاک ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دلجوئی کی خاطر ان کی سہیلیوں سے مل لیا کرتے تھے۔

شاہ خرچ تھے۔ چھٹی پر گھر آتے تو تنخواہ کے سارے پیسے والدہ کے پاس جمع کروا دیتے۔ پھر ان سے لے لے کر خرچ کرتے۔ بٹوہ کھلا پڑا رہتا۔ بہنوں کو ضرورت ہوتی تو بلا تکلف بٹوے سے نکال لیتیں، مالک نے کبھی برا نہیں منایا، چھٹی ختم

ہوتی۔ مالک واپس جانے لگتے تو پیسے ختم ہو چکے ہوتے۔ واپسی کی ٹکٹ کے لئے ماں سے ادھار مانگتے۔ مائیں تو واپسی کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی اور بعض اوقات یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیٹا بری عادتوں میں مبتلا ہے، بیٹوں کو ادھار دینے کے لئے تیار رہتی ہیں لیکن یہ مالک کی امی تھیں۔ جانتی تھیں کہ مالک کے پیسے ختم ہوئے ہیں تو ان کی بیٹیوں پر ہی خرچ ہوتے رہے ہیں۔ مالک کا اپنا خرچ تھا ہی کیا۔ سگریٹ پیتے تھے نہ پان کھاتے تھے۔ چائے سے رغبت نہیں تھی۔ ہوٹل بازی کے قائل نہیں تھے۔ ماں بخوشی ادھار دے دیتیں۔ کبھی واپس نہ لینے کے لئے۔ شادی کے بعد مالک ایک ہزار روپے ماہانہ بیوی کو جیب خرچ دیا کرتے۔ کہا کرتے تھے کہ تمہارا آنا بڑا بابرکت ثابت ہوا۔ تمہارے آنے کے بعد میرے پاس پیسے ٹکنے لگے ہیں پہلے تو بالکل پھانک رہا کرتا تھا۔

ولیمے کے بعد سے ہی انہوں نے بیوی سے تقاضا شروع کر دیا کہ کھیر بناؤ۔ انہوں نے کہا بھی کہ اتنی جلدی گھر والے کام نہیں کرنے دیں گے۔ لیکن ان کا اصرار جاری رہا۔ گھر والوں کو بھی کہا کہ اس ہڈ حرام کو کام پر لگاؤ۔ اس سے کھیر بنواؤ۔ ماں نے کہا بھی کہ میں تجھے کھیر بنا دیتی ہوں لیکن ان کی فرمائش تھی کہ دلہن کے ہاتھ کی کھیر کھاؤں گا۔ پانچویں دن دلہن سے کھیر پکوا کر ہی چھوڑی۔

چھٹی ختم ہوئی تو کیپٹن مالک یونٹ واپس چلے گئے۔ کیپٹن مالک کی یونٹ سول انتظامیہ کی مدد میں مصروف رہنے کے باوجود اپنے افراد کی پیشہ ورانہ تربیت سے بھی غافل نہیں رہی، کھیلوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

ان کی یونٹ کو تین سال تک منگلا ڈویژن کی بہترین یونٹ ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔

اب جو مالک واپس آئے تو چھاؤنی میں ہینڈ بال کے مقابلے ہو رہے تھے۔ ان کی یونٹ بریگیڈ اور ڈویژن کی سطح کے مقابلے جیت کر کور لیول تک پہنچ گئی۔ ان

مقابلوں کے بعد آرمی لیول پر آل پاکستان ہینڈ بال چمپئین شپ کی باری آئی تو کیپٹن مالک کو کور ٹیم کا کیپٹن مقرر کیا گیا۔ یہ مقابلے ملیر چھاؤنی میں منعقد ہو رہے تھے۔ کیپٹن مالک ٹیم لے کر ملیر پہنچے۔ سارا دن تیاریوں اور مقابلوں میں مصروف رہتے اور شام ڈھلے وہ حیدر آباد آجاتے۔ ان مقابلوں کے اختتام پر انہوں نے پندرہ دنوں کی چھٹی لے لی اور ٹیم کو منگلا روانہ کر کے خود حیدر آباد آگئے۔

ادھر یونٹ چکوال میں واپڈا ڈیوٹی پر تھی کہ کارگل آپریشن کے پھیل جانے کا خدشہ پیدا ہوا۔ ۱۹ ایف ایف کو حکم ملا کہ چکوال سے فوری طور پر واپس آئیں۔ اور کسی بھی وقت کوچ کرنے کے لئے تیار رہیں۔ فوج میں جب کوچ کا نقارہ بجتا ہے تو سب سے پہلا کام یہ کیا جاتا ہے کہ چھٹی پر گئے ہوئے افسروں اور جوانوں کو بذریعہ تار مطلع کیا جاتا ہے کہ چھٹی منسوخ، واپس، فوراً۔

کیپٹن مالک کو بذریعہ فون واپسی کی ہدایت ملی۔ انہوں نے نئی نویلی دلہن سے کہا کہ ان کا بیگ تیار کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا بھی کہ دو تین دن رک جائیں لیکن وہ بولے کہ فوج میں چھٹی پر گئے ہوئے افراد کو ڈسٹرب نہیں کیا جاتا لیکن اگر واپس بلا لیا جائے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ کوئی ایمرجنسی ہے اور اب رکنے کا کوئی جواز ہے نہ گنجائش، تم حوصلہ کرو فوجی کی بیوی ہو۔ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تمہیں تیار رہنا چاہیے۔ مختصر سی گفتگو کے بعد وہ ریلوے سٹیشن کی طرف بھاگے۔ آئندہ روز شالیمار میں نشست ملی۔ شام کو چھوٹے بھائی عبدالماجد گھر لوٹے تو بازار سے بڑے بھائی کے لئے پتلون خرید کر لائے۔ مالک کو دی تو بڑے خوش ہوئے۔ ماجد ذرا "کفایت شعار" تھا۔ چنانچہ پہلے تو اسے چھیڑتے رہے "یہ بن بادل برسات کیسی؟ ذرا پتہ کرنا آج سورج کس طرف سے نکلا تھا۔ بھئی یہ خزانہ کہاں سے ہاتھ آگیا"۔ دونوں بھائیوں کے قد کاٹھ ایک سے تھے۔ ہنسی مذاق کے بعد مالک نے پتلون ماجد کو واپس کر دی، بولے "میں جہاں جا رہا ہوں وہاں ان چیزوں کی ضرورت نہیں پڑتی"۔

دوسرے دن یعنی ۲۰ جون کو انہوں نے صبح سویرے دلہن اور بہنوں کو خدا حافظ کہا اور ماجد کے ساتھ سٹیشن روانہ ہو گئے۔ والدین کسی شادی میں شرکت کے لئے میر پور خاص گئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ وہ دوسرے دن ۲۱ جون کو واپس آئے تو مالک سے الوداعی ملاقات نہ ہونے پر بڑے ملول ہوئے۔ اسی دن والدہ دوپہر کا کھانا کھا کر سوئیں تو خواب دیکھا کہ تین عورتیں ان کے گھر آئی ہیں ہاتھوں میں پلاسٹک کے تھیلے اٹھا رکھے ہیں۔ وہ ان سے کہتی ہیں کہ گوشت لے لو۔ احساس ایسا ہوا جیسے بقر عید کا موقع ہے۔ یہ ان سے ان کا نام پوچھتی ہیں تو وہ جواب نہیں دیتیں، بس یہی کہتی ہیں کہ گوشت لے لو۔ یہ ان سے پوچھتی ہیں کہ کیسا گوشت ہے۔ ایک عورت جواب دیتی ہے کہ قربانی کا گوشت ہے۔ جواب دیتے ہوئے وہ تھیلا مالک کی امی کے ہاتھ میں تھما دیتی ہیں۔ وہ اصرار کرتی ہیں کہ تم اپنا نام تو بتاؤ۔ تب وہ جواب دیتی ہیں "سلطانہ"۔ اس دوران تھوڑا سا گوشت تھیلے سے زمین پر بھی گر جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھا کر واپس تھیلے میں ڈالتی ہیں۔ عورتیں واپس چلی جاتی ہیں۔ آنکھ کھلی تو سخت پریشان۔ تینوں بیٹے باہر تھے۔ عبدالمالک راستے میں تھے جبکہ عبدالخالق اور عبدالماجد بہت دور مجاہدین کے کسی کیمپ میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔

ماں بار بار کہے "میرا ایک بچہ نہیں رہا"۔ یہ تو مستقبل کی ایک جھلک تھی۔ اس دن ان کے تینوں بیٹے سلامت تھے۔ رابطے ہوئے تو سب سے بڑے بیٹے عبدالخالق صوبہ سرحد کے ایک قصبہ شوگراں میں تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ عبدالمالک کو طلب کر لیا گیا ہے تو ان کے منہ سے بے اختیار نکلا "مالک ہم سے بازی لے گیا ہے"۔

کیپٹن عبدالمالک رات گئے لاہور ریلوے سٹیشن پر اترے اور وہاں سے بذریعہ بس منگلا کی طرف روانہ ہو گئے۔ صبح سویرے انہوں نے یونٹ میں رپورٹ کر دی۔ یونٹ میں پہنچتے ہی پیغام ملا کہ والدہ سخت پریشان ہیں۔ فوراً گھر فون

کرو۔ انہوں نے فون کیا تو پتہ چلا کہ والدہ نے ایک خواب دیکھا ہے جس پر وہ پریشان ہیں۔ ماں ماں ہوتی ہے اور اولاد کو کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ ماں ان سے کتنا پیار کرتی ہے۔ اگر اندازہ ہو جائے تو وہ کبھی ماں کے پاس سے دور نہ جائیں کہ اتنا بے لوث پیار انہیں کبھی، کہیں اور کسی طرح مل ہی نہیں سکتا۔ لیکن بنانے والے نے یہ نظام اسی طرح بنایا ہے۔ اس کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ تو مالک نے ماں کا خواب سنا تو ہنس دیئے اور بولے "امی! دعا کریں کہ اس خواب کی تعبیر میرے حق میں پوری ہو۔ مجھے شہادت مل جائے"۔

والدہ بولیں: "میں یہ دعا کیسے کر سکتی ہوں کہ تو کافروں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ میں یہ دعا کروں گی کہ تو اور تیرے ساتھی غازی بن کر لوٹیں اور تو جان بوجھ کر پنگا نہ لینا۔ جنگ میں شرارتیں نہ کرنا۔ اپنا خیال رکھنا"۔ ماں کی آواز بھرا گئی۔

"امی! میں نے ستر حوروں سے شادی کرنی ہے اور آپ رو رہی ہیں" کیپٹن مالک نے شوخی سے کہا " بیٹے تیری شادی کر تو دی ہے میں نے۔ کیا کمی ہے اس میں"۔

کیپٹن مالک نے موضوع بدل دیا "اچھا امی! ہے کدھر وہ سمہ شہ کی چیمپئن؟" گھر میں لڈو کھیلتے تو مالک کسی بہن کو اپنا ساتھی بناتے اور بیوی کے خلاف کھیلتے تھے۔ کہتے تھے کہ سمہ شہ کی اس چیمپئن کو ہرانے میں مزہ آتا ہے۔ سب لوگ دلہن کے اس نئے خطاب پر ہنستے تھے۔ اب جو اس چیمپئن کا ذکر آیا تو ماں ہنس دی اور اسے فون پر بلایا۔ علیک سلیک کے بعد بیوی نے بھی "ہدایات" دینی شروع کیں تو مالک نے ہنستے ہوئے کہا "یار! تم تو میری ماں نہیں ہو۔ میری ساتھی ہو، میری دوست۔ مجھے حوصلہ دو اور میری شہادت کی دعا کرو"۔ انہوں نے بھی یہی کہا: "میں آپ کی کامیابیوں کے لئے دعا کروں گی"۔

کارگل آپریشن کی وسعت کے خدشے کے پیش نظر پہلے کیپٹن مالک کی یونٹ کو

پنجاب ہی کے ایک سرحدی علاقے سے واقفیت حاصل کرنے کا حکم ملا لیکن دو جولائی کو ہدایت آئی کہ یونٹ شمالی علاقوں کی طرف روانگی کے لئے تیار رہے۔ ایک دو روز بعد روانگی کا حکم آگیا۔ پوری یونٹ سازوسامان سمیت جیپوں اور ٹرکوں میں سفر کرتی ہوئی پہلے راولپنڈی پہنچی، پھر ایبٹ آباد سے ہوتی ہوئی شاہراہ قراقرم۔ جگلوٹ پہنچ کر عارضی قیام کیا۔ ایک دو روز ستانے کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ جگلوٹ سے دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد وہ استور کی تنگ وادی میں داخل ہوئے۔ اس راستے پر ٹرک نہیں چل سکتے تھے۔ صرف جیپ چلتی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ بائیں جانب دریائے استور کا شور اور دائیں جانب یکلخت بلند ہوتی ہوئیں سنگلاخ چٹانیں۔ استور، گوری کوٹ، گودئی سے گزر کر انہوں نے درہ برزل عبور کیا اور علی کیمپ میں جا ٹھہرے۔ یہاں پہنچتے ہی انہیں حکم ملا کہ کچھ بندے محاذ پر جانے کے لئے تیار کریں۔ تھوڑی دیر میں ہیلی کاپٹر آیا اور کیپٹن مصطفیٰ کی قیادت میں بارہ افراد کو لے کر اڑ گیا۔ انہیں ۱۲-این ایل آئی کے علاقے میں اتار دیا گیا اور علاقے سے واقفیت حاصل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ایک رات یہاں گزار کر یونٹ گلتری پہنچی جہاں بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر محمد مسعود اسلم (ستارۂ جرات) نے یونٹ کا استقبال کیا۔ گلتری کا محاذ اس وقت کیپٹن کرنل شیر (نشان حیدر) کی یونٹ ۱۲ این ایل آئی نے سنبھالا ہوا تھا۔ ایک اور یونٹ بھی وہاں پہلے سے موجود تھی اور یہ علاقہ دشمن کے توپخانے کی زد میں تھا۔ ۱۹ ایف ایف کو ہدایت کی گئی کہ وہ گلتری سے ذرا ہٹ کر ڈیرے لگائیں۔ بتائی گئی جگہ پر اترے انہیں ابھی دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ دشمن کے توپخانے نے آگ اگلنا شروع کر دی۔ سامان بکھرا ہوا تھا اور کمپنیاں اپنی چیزیں سمیٹنے ہی میں مصروف تھیں جب گولہ باری شروع ہوئی۔ چار افراد زخمی ہوئے۔ زخم زیادہ گہرے نہیں تھے۔ دو کی تو وہیں مرہم پٹی کر لی گئی، دو کو ابتدائی طبی امداد کے بعد بنیال بھجوا دیا گیا۔

گولہ باری تھمی تو کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد آصف خان نے حکم دیا کہ سب سے پہلے حفاظتی مورچے کھودے جائیں۔ چنانچہ دو راتوں میں تقریباً دو سو مورچے کھودے گئے۔ اس کے بعد دشمن کی گولہ باری گرچہ شدت سے جاری رہی اور انہوں نے ہزاروں گولے داغے، ایک مرتبہ راکٹ بھی فائر ہوئے لیکن اللہ کے کرم و فضل سے ۱۹ ایف ایف کا کوئی آدمی معمولی زخمی بھی نہ ہوا۔

اس وقت تک ۱۲-این ایل آئی کو گلتری محاذ پر کئی مہینے گزر چکے تھے۔ ان کے افسروں اور جوانوں نے بے جگری سے لڑتے ہوئے بہادری کی نئی داستانیں رقم کی تھیں لیکن ضرورت تھی کہ انہیں ستانے کا موقع مہیا کیا جائے۔ ۱۵ جولائی کو ۱۹ ایف ایف کو حکم ملا کہ وہ ۱۲-این ایل آئی کا علاقہ سنبھالے۔ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ آصف کیلئے پہاڑی علاقہ نیا نہیں تھا۔ وہ ۹۲-۱۹۹۱ء میں سیاچن سیکٹر میں تعینات رہے تھے۔ فرانس سے انہوں نے پہاڑی علاقوں میں جنگ کا ایک کورس بھی امتیازی حیثیت سے پاس کیا تھا۔ انہیں علاقے کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ ۱۲ این ایل آئی کے افسروں نے بھی ان کی رہنمائی کی اور ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں نے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

کیپٹن عبدالمالک کے بڑے بھائی عبدالخالق بھی اس وقت گلتری کے محاذ سے کہیں آگے تین سو مجاہدین کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ یونٹ گلتری پہنچی تو کیپٹن مالک نے مجاہدین کا ٹھکانہ تلاش کر کے درخواست کی کہ ان کے بھائی سے ملوا دیا جائے۔ عبدالخالق کو واپس بلوا لیا گیا اور انہوں نے یونٹ میں آکر مالک سے ملاقات کی۔ دوسرے دن کا کھانا مالک اور ان کی یونٹ کے کچھ افسروں نے مجاہدین کے کیمپ میں کھایا۔

یونٹ نے محاذ سنبھالا تو سب سے مشکل پوسٹ M-6 تھی۔ کیپٹن مالک خطر پسند طبیعت کے مالک تھے۔ انہوں نے کمانڈنگ آفیسر کو ایم سکس کے لئے اپنی

خدمات پیش کیں۔ سی او کو ان کی صلاحیتوں پر بھرپور بھروسہ تھا۔ ان کی پیشکش قبول کر لی گئی اور پچیس آدمیوں کے ساتھ انہیں M-6 کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ فوج کی یونٹوں میں جگہ جگہ ایک پوسٹر نظر آتا ہے جس میں فوجی جوان چھ چھ سات سات کی ٹولیوں میں کھڑے ہیں اور ہیلی کاپٹر انہیں محاذ جنگ پر لے جانے کے لئے زمین پر اترنے کو ہیں۔ اس پوسٹر کے کیپشن پر لکھا ہے۔ ''اگر ہم واپس نہ آئیں تو انہیں بتا دینا کہ ہم نے اپنا آج تمہارے کل کے لئے قربان کر دیا''۔

بالکل وہی منظر تھا۔ کیپٹن عبدالمالک تیار ہو کر پٹھو جھولا پہنے، ہتھیار اٹھائے کیمپ سے نکلے تو کمانڈنگ آفیسر کرنل آصف اور دوسرے ساتھی انہیں الوداع کہنے کے لئے جمع تھے۔ کیپٹن مالک ان کے قریب سے گزرنے لگے تو مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ الوداع کہا اور بولے: ''اگر ہم واپس نہ آئیں تو......سی او نے مالک کو فقرہ پورا نہیں کرنے دیا۔ پیار بھری ڈانٹ پلائی۔ ''شٹ اپ تم واپس آؤ گے'' آنکھوں میں نمی کا غبار لئے سی او بتاتے ہیں کہ کیپٹن مالک کے ادھورے الفاظ ''اف وی ڈونٹ کم بیک'' ساری رات ان کے کانوں میں گونجتے رہے اور جب وہ نقشے پر جھکے مالک کی پوزیشن پر غور کرتے تھے تو اس کی آواز بار بار انہیں یاد آتی تھی۔ ان کا دل کہتا تھا کہ مالک واقعی واپس نہیں آئے گا اور بار بار وہ یہ خیال ذہن سے جھٹکتے تھے۔ کیپٹن مالک کی پوسٹ کافی بلندی پر واقع تھی۔ فوجی جوانوں کو نئے جغرافیائی حالات سے مطابقت (Acclamatisation) کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ دو تین آدمیوں کی طبیعت بگڑ گئی اور انہیں مالک نے واپس بھیج دیا۔ اس طرح ان کے پاس بائیس تئیس آدمی رہ گئے۔ دشمن نے ان کی پوسٹ کو خاص طور پر نشانہ بنایا ہوا تھا اور بے تحاشا گولہ باری جاری تھی۔ ۲۴ جولائی کی شام کو سی او نے ان کی خیریت دریافت کی تو آواز میں بلا کا اعتماد تھا۔ انہوں نے بتایا کہ گولہ باری بہت زیادہ ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ہم سب محفوظ ہیں۔ کرنل آصف نے انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنے مورچوں میں گولہ باری سے محفوظ

رہنے کیلئے مزید اقدامات کریں اور ہتھیاروں کی صفائی پر توجہ دیں کیونکہ ان کا تجربہ یہ کہتا تھا کہ اس علاقے میں انتہائی سرد موسم اور کم درجہ حرارت کی وجہ سے اگر ہتھیاروں کی صفائی نہ ہوتی رہے تو چلتے چلتے رک جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اگلے روز وہ ان کی پوسٹ پر آئیں گے اور رات ان کے ساتھ گزاریں گے۔

کیپٹن مالک کی پوسٹ M-6 سے پیچھے کوئی تین گھنٹے کی مسافت پر ایک چیک پوسٹ قائم کی گئی تھی۔ بٹالین ہیڈکوارٹر سے چیک پوسٹ کا راستہ تو قدرے محفوظ تھا لیکن چیک پوسٹ سے آگے کا راستہ کئی جگہوں سے دشمن کو صاف نظر آتا تھا اور جب کوئی پارٹی ایمونیشن یا راشن لے کر آگے جانے کی کوشش کرتی تھی تو دشمن گولہ باری شروع کر دیتا تھا۔ کیپٹن مالک رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوسٹ پر پہنچے تھے۔ سی او نے ان کی پوسٹ پر آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے یہی روٹ اختیار کرنے کی تجویز دی کہ آپ دن میں چیک پوسٹ پر آ جائیں اور غروب آفتاب کے بعد ہماری طرف سفر کریں، ہمارے گائیڈ آپ کو راستے سے لے لیں گے۔

دوسرے دن صبح سویرے کرنل آصف ہیڈکوارٹر سے روانہ ہوئے اور تقریباً دس بجے چیک پوسٹ پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ کئی گھنٹوں سے ان کا کیپٹن مالک سے کوئی رابطہ نہیں۔ وائرلیس پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اسی دوران ان کی یونٹ کا لانس نائیک ہانپتا کانپتا چیک پوسٹ پر پہنچا اور اس نے بتایا کہ دشمن نے زبردست گولہ باری کے بعد M-6 پر حملہ کر دیا ہے۔ گولہ باری سے ٹیلی فون کی تاریں ٹوٹ گئی تھیں اور کیپٹن مالک کا وائرلیس بھی تباہ ہو گیا تھا۔ گولہ باری کی آوازوں سے یہ تو اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن نے M-6 کو زد پر رکھا ہوا ہے لیکن زمینی حملے کی اطلاع نائیک زرداد کے ہاتھ ملی۔

کرنل آصف نے اپنے توپخانے سے رابطہ کیا اور انہیں نقشے کے حوالے سے بتایا کہ وہ M-6 سے آگے اس سمت میں فائرنگ کریں جدھر سے دشمن پیش قدمی کر رہا

تھا۔ اپنے توپخانے کی طرف سے فوری جواب آیا اور انہوں نے کم و بیش آٹھ سو چالیس گولے فائر کیے۔ بٹالین مارٹر کی طرف سے بھی فائر ہوا۔ اس دوران کرنل آصف نے دس فوجی جوانوں کے ساتھ چیک پوسٹ سے M-6 کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تب نائیک زرداد نے جس کے اوسان خطا ہو چکے تھے بتایا کہ دشمن M-6 اور چیک پوسٹ کے درمیان گھسنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اس نے راہ روک چوکی قائم کر رکھی ہے اور چیک پوسٹ کے آگے ہر حرکت اس کی نظر میں ہے۔ تب کرنل آصف نے بٹالین ہیڈکوارٹر کو حکم دیا کہ جتنے افراد بھی میسر ہیں۔ انہیں لے کر آگے آجائیں۔ اس دوران دشمن نے چیک پوسٹ پر بھی گولہ باری شروع کر دی تاکہ M-6 کو کسی قسم کی کمک نہ پہنچ سکے۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے اس گولہ باری سے چیک پوسٹ کے اردگرد ٹیلیفون کی تاریں بھی تباہ ہو گئیں اور چیک پوسٹ کا رابطہ ہر طرف سے ختم ہو گیا۔ پیچھے رابطہ ضروری تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر دوسری کمپنی کو اس طرف لایا جا سکے۔ کرنل آصف نے سیکنڈ لیفٹیننٹ مدثر کو چیک پوسٹ پر چھوڑا اور صرف اپنے وائرلیس اپریٹر کو ساتھ لئے پیچھے مارٹر پوزیشن پر گئے اور حکم دیا کہ ریزرو کمپنی فوراً آگے پہنچے۔ دلیر کمپنی ایمونیشن اور ہتھیار لے کر آگے بڑھی اور سہ پہر چار بجے مارٹر پوزیشن پہنچ گئی۔ اس دوران کیپٹن مالک کی طرف سے دو افراد مارٹر پوزیشن تک پہنچے اور بتایا کہ دشمن کیپٹن مالک کی پوسٹ والے پہاڑ کے اوپر چڑھ چکا ہے۔ کیپٹن مالک اپنے ساتھیوں سمیت اپنے مورچوں میں ڈٹے ہوئے ہیں اور لڑائی جاری ہے۔

آیئے اب M-6 چلتے ہیں جہاں کیپٹن مالک اپنے بائیس جوانوں کے ساتھ مصروف جہاد ہے۔ انہوں نے اپنی پوزیشن کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ پہاڑ کے بالکل کنارے پر مشاہداتی چوکی قائم کی تھی۔ جہاں سے پہاڑ سے اترنے والی ڈھلانیں صاف نظر آتی تھیں۔ ذرا پیچھے قدرے بلندی پر مین پوزیشن تھی اور یہاں

خودکار ہتھیار یعنی مشین گنیں نصب کی گئیں تھیں اور مین پوزیشن کے پیچھے ریسٹ ایریا تھا۔ کیپٹن مالک جوانوں کے ساتھ رہتے اور اصرار کر کے مشاہداتی چوکی اور مین پوزیشن پر باقاعدہ ڈیوٹی دیا کرتے۔ ۲۵ جولائی کی صبح ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ عبدالمالک نماز فجر ادا کرنے کے بعد مین پوزیشن پر بیٹھے تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھے کہ مشاہداتی چوکی پر مقیم سنتری نے اطلاع دی کہ دشمن اوپر چڑھ رہا ہے۔ انہوں نے قرآن ایک اور فوجی کو تھمایا اور اسے بتایا کہ وہ پارے کے ساڑھے چھ رکوع مکمل کر چکے تھے، وہ سات رکوع مکمل کر کے گن سنبھالے۔ وہ خود مشاہداتی چوکی کی طرف لپکے۔ ایک جوان معروف ان کے ساتھ ہو لیا۔ بیس پچیس منٹ کی چڑھائی کے بعد وہ اوپر پہنچے تو دیکھا کہ تینوں اطراف سے دشمن کے سپاہی اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تقریباً ایک بٹالین کی نفری ہوگی۔ مشاہداتی چوکی سے ذرا نیچے چٹان تھوڑا آگے کی طرف بڑھی ہوئی تھی اور اس کے نیچے کی ڈھلوان مشاہداتی چوکی سے نظر نہیں آتی تھی۔ کیپٹن مالک نے اس بڑھی ہوئی جگہ پر دو مورچے کھدوا چھوڑے تھے تاکہ بوقت ضرورت مشاہداتی چوکی سے نیچے آکر بھی دشمن کو اوپر چڑھنے سے روکا جا سکے۔ کیپٹن مالک کے دیکھتے ہی دیکھتے دشمن کے پانچ چھ جوان ان مورچوں میں آبیٹھے۔ وہ کافی چڑھائی چڑھ کر آئے تھے، ابھی وہ اپنا سانس درست نہ کر پائے تھے کہ کیپٹن مالک نے مشاہداتی چوکی پر موجود حوالدار مبارک شاہ کو آنکھ سے چلنے کا اشارہ کیا۔ صوبہ سرحد کی تحصیل کرک کا یہ لمبا چوڑا جوان بہترین اتھلیٹ تھا اور کیپٹن مالک کے ساتھ کھیلوں میں بھرپور حصہ لیتا تھا۔ اس نے اپنے کمانڈر کا اشارہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی اور چپکے سے چوکی سے باہر نکل آیا۔ دونوں دبے پاؤں نیچے اترے اور ایک ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ انہیں رائفلیں سیدھی کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ البتہ ایک آدمی فائر کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے حوالدار مبارک شاہ زخمی ہوا۔ کیپٹن مالک نے دشمن کے اس سپاہی کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اس دوران مین پوزیشن سے اور بہت سے

لوگ مشاہداتی چوکی تک پہنچ گئے تھے۔ کیپٹن مالک نے انہیں نیچے آ کر حوالدار مبارک شاہ کو واپس لے جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ حوالدار مبارک شاہ کو گھسیٹ کر اوپر لے جا رہے تھے تو دشمن کے تین سپاہی کنارے پر نمودار ہوئے۔ کیپٹن مالک ان پر جھپٹے اور اس سے پہلے کہ انہیں پتہ چلتا کہ کیا ہو رہا ہے، کیپٹن مالک دو فوجیوں کی سٹین گنیں چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت تک کمپنی کا خانساماں علی اصغر کیپٹن مالک کے قریب پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے ایک سٹین گن ان کے حوالے کر کے دوسری سمت پوزیشن لینے کا اشارہ کیا۔ جب وہ کنارے سے جھک جھک کر اوپر چڑھتے ہوئے دشمن کو نشانہ رہے تھے تو مشاہداتی چوکی سے کسی نے بتایا کہ دشمن پہاڑ کی دوسری سمتوں سے اوپر چڑھ آیا ہے اور اس نے مین پوزیشن پر ہلہ بول دیا ہے۔ مالک فوراً مشاہداتی چوکی پر واپس آئے دیکھا مین پوزیشن پر دست بدست جنگ جاری ہے۔ مین پوزیشن پر نائیک غازی ۃ اللہ موجود تھا (حامل اسم ہذا کا اصرار ہے کہ اس کا نام والدین نے ایسے ہی رکھا ہے صوتی اثرات میں غازی تلا بولا جائے گا) دشمن کے ایک سپاہی نے اس پر حملہ کیا تو غازی نے بڑھ کر اس سے رائفل چھیننا چاہی۔ ہاتھ سنگین کے دستے پر پڑا اور جھٹکے سے سنگین غازی کے ہاتھ میں آگئی اور رائفل دشمن کے سپاہی کے ہاتھ میں رہ گئی۔ جھٹکے کی وجہ سے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا غازی نے سنگین اس کے سینے میں گھونپ دی۔ ایک اور مورچے میں دشمن کے ایک سپاہی نے دستی بم پھینکا جو لانس نائیک حبیب الرحمٰن کے عین کاندھے پر آ کر گرا اور وہ موقع پر شہید ہو گیا۔

کیپٹن مالک نے لمحے بھر کو پورے منظر کا جائزہ لیا اور پھر دشمن کی چھینی ہوئی سٹین گن سے فائر کھول دیا۔ فائرنگ کا رخ پہاڑ کے کناروں کی طرف تھا جہاں سے دشمن کے سپاہی نمودار ہو ہو کر مین پوزیشن کی طرف جاتے تھے۔ مشاہداتی چوکی کی طرف سے فائر ہوا تو مین پوزیشن پر حملہ آور سپاہی واپس کناروں کی طرف بھاگے۔ کئی

لقمہ اجل بنے لیکن چند لمحوں میں پوسٹ دشمن سے خالی ہو گئی۔ کیپٹن مالک مین پوزیشن پر واپس آ گئے۔ ان کے پیچھے پہاڑ تھا اور اس کے پیچھے تین گھنٹوں کی مسافت پر چیک پوسٹ اور دونوں پوسٹوں کے درمیان دشمن گھس آیا تھا۔ گویا کیپٹن مالک چاروں طرف سے دشمن میں گھیرے ہوئے تھے۔

ادھر حیدر آباد میں صبح کیپٹن مالک کے والد شیر محمد صاحب کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ ان کے سینے میں رہ رہ کر درد اٹھتا تھا اور بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ رات گئے طبیعت سنبھلی۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ چبھے کانٹا جو کابل میں تو ہندوستان کا ہر پیر و جواں کیوں اور کیسے بے تاب ہو جائے جبکہ بظاہر ذرائع ابلاغ بھی موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ عالم جو ہمارے سامنے ہے اور جس میں مادی قوانین کار فرما نظر آتے ہیں، واحد عالم نہیں ہے بلکہ اسی کائنات میں اور بہت سے عالم ہیں۔ بہت سے نظام ہیں۔ ہم جب نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو سورۃ فاتحہ میں الحمدللہ رب العلمین کہہ کر ان جہانوں کے ہونے کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان جہانوں میں جاری و ساری قوانین ابھی تک ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔ ہم جس خاص واقعے کے حوالے سے بات کر رہے ہیں، سائنسی دنیا اسے ٹیلی پیتھی کے نام سے پکارتی ہے اور اس کی بہت سی شکلیں روز مرہ زندگی میں سامنے آتی رہتی ہیں لیکن ان باتوں کی توجیہہ مکمل علم کے ساتھ شاید ممکن نہ ہو۔ تو ۲۵ جولائی کو کیپٹن مالک جب دشمن میں گھرے ہوئے تھے، ان کے والد کی طبیعت خراب ہوئی۔ ایک رات پہلے ہی ان کی بڑی بہن نے خواب میں پاکستان کے قومی پرچم میں لپٹے تابوت دیکھے اور قربانی کے گوشت والے ماں کے خواب کا ذکر تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔

کارگل سیکٹر میں گلتری کے محاذ پر کرنل آصف بھر پور کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح کیپٹن مالک کو کمک پہنچائی جا سکے۔ لیکن چیک پوسٹ سے آگے دشمن کی بلاکنگ پوزیشن کی وجہ سے پیش قدمی نہ ہو سکی۔ انہوں نے اپنے دو افسروں کو مامور کیا کہ

علاقے کا جائزہ لے کر آگے جانے کا کوئی اور راستہ دھونڈیں لیکن M-6 کو جانے والے سارے راستے دشمن کے براہ راست مشاہدے کی زد میں تھے۔ جونہی کوئی آگے بڑھتا، دشمن کا توپخانہ آگ برسانا شروع کر دیتا۔ کیپٹن مالک کو اپنی جنگ آپ لڑنا تھی۔

وہ مین پوزیشن پر واپس آئے تو دیکھا کہ ایک جوان اشرف کی ٹانگیں بری طرح کچلی گئی ہیں۔ وہ درد سے بری طرح کراہ رہا تھا اور چاروں طرف سے نمودار ہونے والے دشمن کے فوجیوں کو دیکھ دیکھ کر اسے خدشہ تھا کہ وہ شاید واپس بھی نہ جا سکے۔ کہیں دشمن کے ہاتھوں قیدی نہ بن جائے۔ اس نے بار بار اپنے ساتھیوں اور کیپٹن مالک سے درخواست کی کہ سینے میں گولی مار کر اسے ختم کر دیا جائے لیکن کیپٹن مالک نے اسے حوصلہ دیا، اس کی مرہم پٹی کروائی اور اسے ریسٹ ایریا میں بھجوا دیا۔ نائیک غازی ۃ اللہ کو ساتھ لے کر انہوں نے اپنی پوسٹ کے کناروں کا ایک چکر لگایا تو دیکھا کہ تینوں اطراف سے دشمن کے سینکڑوں سپاہی اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ دور بڑے بڑے پتھروں کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں۔ دن کے وقت تو اوپر چڑھنے والوں کو نشانہ بنا سکتے تھے لیکن خدشہ تھا کہ رات کی تاریکی میں وہ پوسٹ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اتنا ایمونیشن تو نہیں تھا کہ رات کی تاریکی میں وہ ہر طرف اندھا دھند فائرنگ کرتے رہیں۔ تب انہوں نے غازی ۃ اللہ اور نائیک نذر کو پاس بلایا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ سپاہی اشرف کو ساتھ لے کر پیچھے جانے کی کوشش کریں۔ باقی ساتھیوں کو بھی حکم دیا کہ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔ وہ خود آخری وقت تک اپنی پوزیشن پر ڈٹے رہنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔

نائیک غازی اور نذر نے پہلے تو واپس جانے سے انکار کر دیا۔ لیکن کیپٹن مالک نے انہیں ڈانٹ پلائی اور سختی سے حکم دیا کہ وہ سپاہی اشرف کو ساتھ لے کر واپس جائیں۔ دونوں ریسٹ ایریا میں واپس آئے تو سپاہی اشرف نے پھر ان سے

درخواست کی کہ اسے گولی ماردی جائے۔ انہوں نے کیپٹن مالک کا حکم سنایا اور بتایا کہ دوا سے لے کر پیچھے جا رہے ہیں۔ پہاڑ کے پیچھے ایک ڈھلوان تھی جس پر برف پڑی ہوئی تھی۔ غازی ۃ اللہ نے سوچا کہ اسے عبور کرنے میں کافی دیر لگ جائے گی کیوں نہ سکی انگ (sking) کا ستعمال کیا جائے۔ انہوں نے تین سکی لیں۔ اشرف خود بھی اس کھیل کا ماہر تھا۔ اگر توازن برقرار رکھ سکا تو چلنے کی دشواری سے بچ سکتا تھا۔ تیار ہو گیا۔ لیکن جب وہ ڈھلوان سے اتر رہے تھے تو رفتار پر قابو نہ رکھ سکا اور بائیں طرف ایک کھائی میں گر گیا۔ غازی اور نذر سیدھ میں اترتے چلے گئے۔ اس بات کا موقع تھا نہ گنجائش کہ وہ واپس آ کر اشرف کی خبر لیتے۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ کھائی میں گر کر وہ شہید ہو گیا ہو گا۔ بہت بعد میں ۱۵ اگست کو پتہ چلا کہ وہ بطور جنگی قیدی بھارتیوں کی تحویل میں ہے۔

غازی اور نذر کی روانگی کے بعد کیپٹن مالک نے اپنے باقی ساتھیوں کو واپس بھیجنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ کیپٹن مالک کو اکیلا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن انہوں نے سختی سے سمجھایا کہ یہ میرا حکم ہے اور وہ حکم عدولی نہ کریں۔ بادل نخواستہ ان میں سے کچھ بائیں جانب مار پولا سیکٹر کی طرف اور کچھ دائیں جانب اردو کس نالے میں اتر کر کہیں کے کہیں جا پہنچے لیکن ان کی جانیں بچ گئیں۔ پوسٹ چھوڑنے والے آخری افراد نے دیکھا کہ کیپٹن مالک سٹین گن لئے پہاڑ کے ایک کنارے پر پوزیشن لئے ہوئے تھے اور کافی آگے جھک کر پتھروں کی اوٹ میں چھپے دشمن پر فائرنگ کر رہے تھے۔ اسی دوران مشین گن کا ایک برسٹ فائر ہوا جو ان کے سینے پر لگا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے اور ان کا جسم قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے جا گرا۔ یوں اس بطل جلیل کی شہادت کی آرزو پوری ہو گئی۔ یہ دوپہر دو ڈھائی بجے کا واقعہ ہے۔ کیپٹن مالک نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر اپنے انیس ساتھیوں کی جانیں بچائیں۔ ان کے ساتھ تین اور جوان شہید ہوئے لانس حوالدار مبارک شاہ، لانس

نائیک حافظ حبیب الرحمٰن اور نائیک منیر۔ ایک جوان سپاہی اشرف قیدی ہوا جبکہ دشمن کی پچاس لیس لاشیں گنی گئیں جو ایم۔ سکس کے ارد گرد بکھری ہوئی تھیں۔ جو گہری کھائیوں میں گر کر ہلاک ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔

کیپٹن مالک کی شہادت کی خبر سی او کو شام چھ بجے کے قریب ملی۔ کیپٹن مالک کی شہادت کا مطلب تھا کہ ایم۔ سکس پر ہمارا کوئی آدمی باقی نہیں بچا۔ اس پر سی او نے اپنے توپخانے کو ایم۔ سکس پر گولہ باری کرنے کو کہا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ خود دشمن کا توپخانہ بھی ایم۔ سکس پر گولے پھینک رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دشمن کو کیپٹن مالک کی شہادت کی خبر نہیں تھی اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ اپنے تمام ساتھیوں کو بحفاظت واپس بھجوا چکے ہیں۔ رات ہونے کو تھی اور پیدل دستوں نے توپخانے کا فائر مانگ رکھا تھا تا کہ رات کو ان کی پیش قدمی سے پہلے پہلے اپنی دانست میں ایم۔ سکس پر موجود افراد کا زیادہ سے زیادہ نقصان کیا جا سکے۔ رات کسی وقت انہوں نے ایم۔ سکس۔ پر قبضہ کر لیا۔

۲۷ جولائی کو فریقین کے درمیان فلیگ میٹنگ ہوئی۔ انڈیا کی طرف سے میجر ناگی مذاکرات کے لئے آیا۔ ان کی طرف پہاڑ بلند تھا۔ وہ سفید جھنڈا اٹھائے تھوڑا سا نیچے اترا اور دامن میں آ کر رک گیا۔ پاکستان کی طرف سے میجر محمد اور ایک اور افسر گئے۔ میجر ناگی نے اوپر ہی سے انگریزی میں پوچھا "کیا آپ کمپنی کمانڈر ہیں؟"

میجر محمد نے اثبات میں جواب دیا اور نیچے آنے کو کہا۔ میجر محمد نے کہا کہ ہم پہلے ہی زیادہ فاصلہ طے کر کے آئے ہیں، تم نیچے آؤ۔ وہ وہیں چوکڑی بھر کر بیٹھ گیا اور بولا'

"کھترے کی کوئی بات نہیں۔ اوپر آ جاؤ"۔

میجر ناگی کے ہمراہ چھ سات افراد تھے اور سب مسلح تھے۔ حلیے سے وہ سب سپیشل سروسز گروپ کے لوگ لگتے تھے اور انہوں نے Ak-47 مشین گنیں اٹھا رکھی

تھیں جبکہ پاکستانی وفد دو افسروں پر مشتمل تھا اور ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن ناگی ان کے پیچھے اور ارد گرد نظریں دوڑاتا تھا اور بڑی مشکل سے چند قدم نیچے آیا۔ میجر محمد تھوڑا آگے بڑھے اور اسے بتایا کہ ہمارے چند افراد لاپتہ ہیں اگر تمہارے پاس ہیں تو واپس کر دو۔

"کتنے افراد لاپتہ ہیں" میجر ناگی نے پوچھا۔

"پانچ"

"صرف پانچ"

ایم۔ سکس پر انہوں نے جتنی آگ اور لوہا برسایا تھا اور پوری بٹالین کے حملے کو جس زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے پیش نظر ان کا خیال تھا کہ وہاں کم سے کم دو کمپنیاں یعنی تین ساڑھے تین سو کی نفری تو ہو گی لیکن جب اسے پتہ چلا کہ وہاں صرف بائیس افراد تھے اور ان میں سے صرف پانچ لاپتہ ہیں تو وہ سخت حیران ہوا۔

میجر ناگی کے ہمراہ وڈیو ٹیم بھی تھی اور فوٹو گرافر بھی جو سارے منظر اور مکالموں کو فلما رہے تھے۔ میجر ناگی نے میجر محمد سے کہا کہ پاکستانی دستے لائن آف کنٹرول سے ایک کلومیٹر پیچھے چلے جائیں۔ میجر محمد نے جواب دیا کہ انہیں اپنے علاقے میں رہنے کا حق حاصل ہے اور یہ مطالبہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے۔ تھوڑی دیر پھر لاپتہ افراد پر گفتگو ہوئی۔ طے ہوا کہ فلیگ میٹنگ کے دو گھنٹے بعد دونوں افسر وائرلیس پر گفتگو کریں گے۔ اس کے لئے فریکوئنسی ۳۵۱۵ طے کی گئی۔ دو گھنٹوں بعد وائرلیس کھولے گئے تو میجر ناگی نے اطلاع دی کہ ان کے پاس تین افراد کی لاشیں موجود ہیں۔ طے یہ ہوا کہ ۲۹ جولائی کو ایک فلیگ میٹنگ کے دوران نعشیں واپس کر دی جائیں گی۔

۲۹ جولائی کو مقررہ جگہ پر صبح کے وقت فلیگ میٹنگ منعقد ہوئی۔ بھارت کی

طرف سے ایم۔ سکس پر حملہ کرنے والی بٹالین ۳ گرینیڈ ئر کے کمانڈنگ آفیسر کرنل شرما ایک پوری کمپنی لے کر آئے۔ دو پلاٹونیں ان کی اپنی تھیں جبکہ ایک پلاٹون کمانڈوز پر مشتمل تھی۔ پاکستان کی طرف سے ایک پلاٹون آگے گئی۔ ابتدائی مذاکرات میں نعشوں کی واپسی کا طریق کار طے کیا گیا اور اس کے مطابق بھارتیوں نے تینوں نعشیں درمیان میں رکھ دیں۔ اس طرف بھارتی قطاروں میں کھڑے تھے اور اپنی جانب پاکستانی سپاہی۔ کرنل شرما نے سلیوٹ کرنے کا کاشن دیا۔ دونوں طرف کے سپاہیوں نے شہداء کو سلیوٹ کیا۔ پھر پاکستانی ایڈ جوئنٹ کے کاشن پر اپنے سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کی نعشیں بھارتی سٹریچروں سے اتار کر اپنے سٹریچروں پر رکھیں۔ میجر محمد نے اپنے شہداء کے جسموں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ایک لانس حوالدار مبارک شاہ تھا جس کے سر کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ لانس نائیک حافظ حبیب الرحمٰن کا ایک پاؤں غائب تھا اور نائیک منیر کا سر کچلا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی زخم تھے لیکن اس کی کلائی سے بندھی ہوئی ڈسک سے اس کی شناخت ہو گئی۔ پاکستانی فوجی سٹریچر اٹھانے کیلئے جھکے تو کرنل شرما کے کاشن پر دونوں فریقوں نے ایک بار پھر سلیوٹ کیا اور اس وقت تک اسی پوزیشن میں کھڑے رہے جب تک پاکستانی اپنی پوزیشن پر واپس نہیں پہنچ گئے۔ میجر محمد کو یوں لگا جیسے وہ اپنے جوان بیٹوں کی نعشیں لے کر واپس جا رہا ہے۔

کیپٹن مالک کی شہادت کے دوسرے دن کی بات ہے کہ ان کے بڑے بھائی عبدالخالق اپنے بھائی مالک کی خیر خیریت پوچھنے یونٹ میں آئے۔ افسر پریشان تھے کہ انہیں ان کے بھائی کی شہادت کی اطلاع کون، کیسے دے۔ بالآخر یہ ذمہ داری کیپٹن عامر کو سونپی گئی لیکن وہ اس مرد مجاہد کے ردعمل پر حیران رہ گئے۔ انہیں مالک کی شہادت کی خبر دی گئی تو ان کا فوری ردعمل یہ تھا: "مبارک ہو"۔ کچھ دیر چپ رہے، پھر بولے" وہ مجھ سے بہتر تھا کہ شہادت کا رتبہ ملا۔ میں پچھلے گیارہ سال سے لڑ رہا ہوں

لیکن یہ سعادت نہیں ملی"۔ اس وقت کمانڈنگ آفیسر کہیں اور تھے۔ عبدالخالق نے فون پر ان سے بات کی اور انہیں مالک کی شہادت کی مبارکباد دی۔ تھوڑی دیر یونٹ میں ٹھہر کر واپس چلے گئے۔ دوسرے دن پھر آئے تو جلیبیوں کے ڈبے اٹھائے ہوئے تھے۔ خوشی خوشی مٹھائی بانٹی اور مجاہدین کے کیمپ میں واپس چلے گئے۔ جس قوم میں ایسے سپوت موجود ہوں، اسے کون سرنگوں کر سکتا ہے۔

کیپٹن مالک کی شہادت والے دن کی بات ہے۔ ان کے گھر میں کپڑوں کی دھلائی ہوئی تھی۔ غروب آفتاب کے بعد ان کی چھوٹی بہن نادیہ کپڑے سمیٹنے صحن میں آئیں۔ ایک شال کو رسی سے اتارنے لگیں تو تازہ گلابوں کی تیز مہک محسوس ہوئی۔ وہ سمجھیں کہ شاید بھابھی کی شال کی خوشبو ہے جو دھلائی پر بھی نہیں گئی۔ لیکن وہاں تو پورا صحن معطر تھا۔ انہوں نے حیران ہو کر بھابھی کو آواز دی۔ وہ باہر آئیں تو انہوں نے بھی خوشبو محسوس کی۔ نادیہ اور سعدیہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں۔ وہ بڑی بھابی اور والدہ کو بھی بلا کر لائیں لیکن نازنین کوثر اداس تھیں۔ انھیں صاحب خوشبو کا انتظار تھا۔

خیال یار، ترے سلسلے، نشوں کی رتیں
جمال یار، تری جھلکیاں، گلاب کے پھول
یہ کیا طلسم ہے، یہ کس کی یاسمیں بانہیں
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں گلاب کے پھول

"یہ خوشبو اکیلی کیوں آئی ہے" کوثر سوچتی تھیں۔ "کیا صاحب خوشبو سے جدا ہو گئی؟" کتنی ہی دیر وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی رہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگی۔ خود ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی۔

خوشبو کے جھونکے کئی روز تک محسوس ہوتے رہے۔ غروب آفتاب کے بعد سب لوگ گھر کے صحن میں جمع ہو جاتے اور خوشبو کے جھونکوں کا باقاعدہ انتظار کیا

جاتا۔ مغرب کی اذان کے بعد پورا صحن تازہ گلابوں کی مہک سے معطر ہو جاتا۔ یہ خوشبو ڈیڑھ سے دو منٹ تک رہتی اور صحن میں موجود ہر شخص اسے محسوس کرتا۔

۳۰ جولائی کو بڑے بھائی عبدالخالق گلتری محاذ سے واپس پہنچے۔ سیدھے گھر نہیں گئے بلکہ اپنے سسرال گئے۔ وہاں سے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر کے گھر آئے۔ رات دس بجے انہوں نے گھر والوں کو عبدالمالک کی شہادت کی خبر سنائی۔ گھر والے تو پہلے ہی یہ بات سمجھ چکے تھے۔ یہ تو محض تصدیق تھی!!!!



...آتش نمرود میں عشق

میجر طارق محمود کا تعلق شاہینوں کے شہر سرگودھا سے ہے۔ ان کے والد فلک شیر پاک فوج کی آرمی ایجوکیشن کور سے اعزازی کپتان کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ طارق نے میٹرک ملٹری کالج جہلم سے اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاکستان ائرفورس کالج سرگودھا سے پاس کیا اور ۱۹۸۷ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں شمولیت اختیار کی۔ اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر قاسم کمپنی کے کمپنی سارجنٹ میجر ہوئے۔ ستمبر ۱۹۸۹ء میں پاسنگ آؤٹ کے بعد ۴۸ ایف ایف میں تعینات ہوئے جو اس وقت سیالکوٹ میں مقیم تھی۔ بیسک کورس امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۹۴ء میں مڈ کیریئر کورس کرنے سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ پہنچے۔ کورس کی تکمیل پر انھیں سکول ہی میں بطور انسٹرکٹر تعینات کر دیا گیا۔

تین سال بعد واپس اپنی یونٹ میں آئے جو اس وقت بنوں میں تھی۔ سال بعد انھیں شمالی علاقہ جات میں متعین ناردرن لائٹ انفنٹری کی ایک یونٹ میں پوسٹ کر دیا گیا جہاں زندگی کے خطرناک ترین مراحل ان کے منتظر تھے۔ زندگی اور موت میں فاصلہ کم تھا۔ دلیری اور ذہانت میں توازن رکھتے ہوئے ایمان وایقان کی صراط مستقیم پر چلنے کا کڑا امتحان۔ تین ماہ تک وہ بالتورو گلیشیر کی بیس ہزار سے بھی اونچی ایسی ایسی

بلندیوں پر رہے جہاں محض پہنچنے کے لئے اکیس دن درکار ہوتے ہیں۔

بلندترین پوسٹ پر ایک فوجی کو زیادہ سے زیادہ اکیس دن رکھا جاتا ہے اور پھر نیچے بلا لیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ عرصے کا قیام ایک عام آدمی کے لیے ممکن نہیں۔ اس عرصے میں بھی اعصابی ردعمل (Reflexes) سست ہو جاتے ہیں۔ پھیپھڑے تھک جاتے ہیں اور برف سے منعکس ہونے والی کرنوں کی چندھیا دینے والی روشنی سے اچھی بھلی کھلتی ہوئی رنگت کا انسان کالا بھجنگ ہو جاتا ہے۔ بلندیوں سے ''تازہ تازہ'' اترے ہوئے انسان سے گفتگو عجیب تجربہ ہے۔ آپ اس سے صرف نام پوچھیں تو پہلے وہ خلا میں گھورتا رہے گا اور عین ممکن ہے کہ اس دوران وہ آپ کا سوال ہی بھول جائے اور جواب ملے ''میں کل ہی آیا ہوں''۔ ایسے شخص کو نارمل ہونے میں تین سے سات دن لگتے ہیں۔

میجر طارق بالتورو کی بلندیوں سے نیچے اترے تو شمشیر و گلستان سیکٹر، حمزی گھنڈ، گوریا سکو اور سکردو میں مختلف فرائض انجام دیتے رہے۔ جون کے آخری ہفتے میں انھوں نے مانی اور نذیر سیکٹر کی ریکی کی اور بالآخر انھیں حکم ملا کہ تیس آدمیوں کی ایک پارٹی لے کر خاقان پوسٹ پر جائیں۔ وہ پہلے ریاض بیس پہنچے۔ وہاں سے صبح سات بجے چل کر دوپہر تین بجے تک بدر کیمپ پہنچے۔ وہاں سے تیس آدمیوں کو لے کر روانہ ہونے کو تھے کہ دشمن کے توپخانے نے زبردست گولہ باری شروع کر دی۔ گولے یوں برس رہے تھے جیسے بارش برستی ہو۔ انہوں نے حکام بالا سے اجازت چاہی کہ گولہ باری تھمنے تک وہ رک جائیں لیکن انہیں جس مشن پر بھیجا جا رہا تھا، اس میں ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ حکم ہوا کہ نہیں فوراً روانہ ہو جائیں۔ تب ان کے ساتھی کیپٹن سید شمس، کیپٹن نبی بخش اور ڈاکٹر واصف انہیں الوداع کہنے کے لئے جمع ہوئے۔ ہر ساتھی انہیں کوئی نہ کوئی دعا بتاتا تھا اور پھر دعاؤں کے ساتھ وہ بدر کیمپ سے رخصت ہوئے۔

ان کا کہنا ہے کہ اتنی ساری دعائیں کہاں یاد رہتی ہیں۔ ''میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی درود شریف پڑھنے کو کہا اور خود بھی درود شریف پڑھتا ہوا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں ایک گنہگار انسان ہوں لیکن میں نے دیکھا کہ دلوں کی گہرائیوں سے ابھرتے ہوئے درود شریف نے ہم پر عافیت کی چادر تان دی ہے۔ گولے برس رہے ہیں اور ہم چلے جا رہے ہیں۔ کوئی کوئی گولہ تو چند گز کے فاصلے پر آ کر گرتا لیکن عجیب اتفاق ہے عین اس وقت ہم کسی نہ کسی بڑے پتھر (Boulder) کے پیچھے ہوتے اور یوں گولہ پھٹنے سے اڑنے والے بموں کے ٹکڑوں (Splinters) اور پتھروں سے محفوظ رہتے اور پھر یوں ہوا کہ گولہ باری ہمارے پیچھے شفٹ ہو گئی یعنی ہم جہاں سے گزر آتے تھے گولے وہاں گرتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے دشمن کو ہمارے بارے میں معلوم ہو گیا تھا اور وہ ہمارے راستے کو نشانہ بنا رہا تھا، لیکن یہ درود شریف کا ہی معجزہ تھا کہ ہم آگے بڑھتے رہے اور گولہ باری ہمارے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ سورج غروب ہونے کے بعد تک گولہ باری جاری رہی، پھر تھم گئی۔ رات کو دس بجے کے قریب ہم اپنی منزل حسن رج (Ridge) پہنچے اور اپنے ساتھیوں کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ کسی کو خراش تک نہیں آئی''۔

رات ڈھائی بجے کے قریب این ایل آئی کی ایک یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل تنویر کا فون آیا کہ دشمن نے عاقل پوسٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ کمپنی آفیسر لیفٹیننٹ معاذ سنبل کو یہ پوسٹ واپس لینے کے لیے بھیجا جائے۔ میجر طارق نے دس آدمی دے کر معاذ کو عاقل پوسٹ کی طرف بھیجا اور خود حسن رج کے دفاع میں مصروف ہو گئے۔ بچے کھچے آدمیوں کو انھوں نے نیم دائرے کی شکل میں متعین کیا اور تین مشین گنوں کو اس طرح لگایا کہ دو گنیں نیم دائرے کے سروں پر تھیں اور ایک درمیان میں۔ ادھر عاقل پوسٹ پر دشمن کی نفری زیادہ تھی، وہ تھے بھی بلندی پر۔ لیفٹیننٹ معاذ کا حملہ پسپا کر دیا گیا۔ صبح سویرے میجر طارق کے قائم مقام کمانڈنگ

آفیسر میجر ارشد کا فون آیا کہ میجر طارق خود عاقل پوسٹ پر حملہ کریں اور اسے دشمن کے قبضے سے چھڑائیں۔ اس وقت تک میجر طارق اپنے آدمیوں کو حسن رج کے دفاع پر متعین کر چکے تھے اور لیفٹیننٹ معاذ کے ساتھ جانے والے آدمیوں کو ملا کر کل بارہ آدمی بنتے تھے جو حملے میں استعمال ہو سکتے تھے۔ میجر طارق نے مزید افرادی قوت اور ایمونیشن کی درخواست کی۔ ۶۰ ملی میٹر کی ایک مارٹر اور آر پی جی۔ ۷ راکٹ لانچر بھی طلب کیے۔ اس کے جواب میں بدر کیمپ سے لیفٹیننٹ مظاہر کی قیادت میں تیس آدمی اور بھیجے گئے جو ساری رات دشمن کی گولہ باری میں سفر کرتے ہوئے صبح ساڑھے چار بجے میجر طارق تک پہنچے۔ مارٹر کے ساتھ کل گیارہ گولے تھے۔ راکٹ لانچر پہنچ گیا تھا لیکن بھیجنے والے اس کے راکٹ بھیجنے بھول گئے تھے۔

اس وقت تک میجر طارق، لیفٹیننٹ معاذ سے تفصیلی انٹرویو کر کے دشمن کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر چکے تھے۔ صورتحال یہ تھی کہ میجر طارق ''حسن رج'' کی ایک ایسی ڈھلوان پر موجود تھے جو دشمن کی نظر سے اوجھل تھی۔ اس ڈھلوان سے اوپر چڑھیں تو چوٹی کے پار ایک نشیب تھا اور اس کے بعد ایک اور چوٹی جسے عاقل پوسٹ کا نام دیا گیا تھا۔ معاذ کے مطابق اس پر دشمن کے تیس کے قریب آدمی موجود تھے۔ لڑائی کے عام اصولوں کے مطابق دفاع میں لگی ہوئی نفری پر حملہ کرنے کے لیے کم از کم تین گنا زیادہ افرادی قوت چاہیے بلکہ پہاڑی علاقوں میں بلندی پر بیٹھے دشمن کے پاؤں اکھاڑنے کے لیے تو اور بھی زیادہ نفری چاہیے جیسا کہ خود بھارتی سینا نے کارگل آپریشن میں کیا کہ بلندی پر بیٹھے دس بارہ آدمیوں پر حملے میں دو دو سو بلکہ تین تین سو افراد استعمال کیے اور پھر بھی منہ کی کھائی کہ بلندی پر بیٹھے افراد کے حوصلے جوان ہوں تو ان پر قابو پانا ممکن نہیں۔ لیکن میجر طارق کے پاس کل بیالیس افراد تھے۔ ان میں سے بھی کچھ پیچھے چھوڑنا تھے کہ وہ فائر کور مہیا کریں۔

دن نکل آیا تھا۔ میجر طارق نے اوپر جا کر دشمن کی پوزیشنوں کا جائزہ لیا تو پتہ

چلا کہ ان کی ایک پوزیشن تو عاقل پوسٹ کے دامن میں ہے اور دو پوزیشنیں چوٹی پر۔ چوٹی کے پیچھے پہاڑ کے نیچے غالباً ان کا بیس کیمپ تھا اور یقیناً وہاں سے ڈھلوان بالکل سیدھی تھی کہ دائیں طرف سے جا کر دیکھا تو وہاں رسے لٹک رہے تھے جو وہ اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے کے لیے استعمال کرتے ہوں گے۔ میجر طارق کو جائزے کے دوران ہی چھ افراد ان رسوں پر چڑھتے ہوئے نظر آئے جو شاید ایمونیشن یا راشن لے کر اوپر آ رہے تھے۔ میجر طارق نے مشین گن کی مدد سے ان پر فائر کروایا۔ چار افراد زخمی ہوئے تھے۔ میجر طارق کو معلوم نہیں کہ بعد ازاں وہ مر کھپ گئے یا بچ گئے۔ اس کے فوراً بعد دشمن کی طرف سے زبردست فائر آیا تو یہ سب لوگ اوٹ میں ہو گئے۔ اب طارق نے اپنے افراد کو تین پارٹیوں میں تقسیم کیا۔ ایک پارٹی کو لیفٹیننٹ معاذ کی قیادت میں دائیں طرف روانہ کیا کہ وہ چکر کاٹ کر نالے میں اتر جائیں اور پھر دائیں ڈھلان سے دشمن پر حملہ کریں۔ دوسری پارٹی کو بائیں طرف سے ہوتے ہوئے دشمن کے عقب میں پہنچنے کی ہدایت کی۔

میجر طارق نے اپنے لیے مشکل ترین فیصلہ کیا کہ عین سامنے سے دشمن کو اس طرح الجھایا جائے کہ وہ عقب اور اپنے بائیں سے آنے والے افراد کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اگر اسے سامنے سے مصروف نہ کیا جاتا تو وہ نالے کی طرف سے آنے والے لیفٹیننٹ معاذ کی پارٹی پر بھرپور فائرنگ کر سکتے تھے۔ میجر طارق، ایک سپاہی جس کا نام ہادی تھا، کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ چوٹی پر پہنچے تو پرلی چوٹی کے دامن میں دشمن کو موجود پایا۔ طارق کا فاصلہ ان سے بمشکل پچاس ساٹھ گز ہوگا۔ طارق نے انھیں للکارتے ہوئے ہتھیار پھینکنے اور اپنی پوزیشنوں سے نیچے اترنے کو کہا۔ وہ سخت حیران کہ یہ بلائے ناگہانی ان پر کہاں سے نازل ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے سر پر سفید رومال باندھ رکھا تھا۔ طارق نے جب انھیں ہتھیار پھینکنے کو کہا تو سفید رومال والے نے پوچھا کہ ان کی یونٹ کون سی ہے۔ میجر طارق نے کہا کہ وہ اپنی پوزیشنوں

سے باہر نکل کر نیچے آئیں تو وہ اپنی یونٹ بھی بتا دیں گے۔ اسی دوران چوٹی پر موجود دشمن کو بھی ان کی موجودگی کی خبر ہو گئی اور وہ چوٹی کے قریبی سرے پر آ کر ان پر فائرنگ کرنے لگے۔ میجر طارق اور سپاہی ہادی نے دائیں بائیں کے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے جوابی فائر کیا لیکن اس دوران چوٹی کے دامن والی پارٹی کو فرصت مل گئی۔ ان میں سے کچھ تو اپنی پوزیشنوں میں چھپ گئے اور کچھ اپنے دائیں طرف موجود نشیب سے ہوتے ہوئے مین پوزیشن کی طرف اوپر بھاگے۔ طارق خود تو دشمن پر فائر کرتے رہے اور سپاہی ہادی کو بتایا کہ فوراً پیچھے جا کر فائر بیس والی پارٹی کو کہیں کہ وہ بائیں طرف سے آگے جائیں اور دشمن کو پیچھے بھاگنے نہ دیں۔ وہ چلے لیکن ان کا راستہ دشمن کی مین پارٹی کی زد میں تھا وہ تو آگے نہ جا سکے لیکن ایک این سی او نائیک عمر دین فائر اور موو کے ذریعے میجر طارق تک پہنچ گیا۔ اب وہ تین ہو گئے۔

تقریباً پندرہ منٹ کی فائرنگ کے تبادلے کے بعد نائیک عمر دین نے بتایا کہ اس کا ایمونیشن ختم ہو گیا ہے۔ میجر طارق نے اسے ہدایت کی کہ وہ پیچھے جائے اور نئے میگزین لے کر فوراً آگے آئے۔ وہ ابھی واپس نہیں آیا تھا کہ سپاہی ہادی نے شکایت کی کہ اس کی رائفل کا برج بلاک پھنس گیا ہے۔ اس طرح دشمن کے مقابلے میں میجر طارق تنہا رہ گئے۔ انھوں نے فائر جاری رکھا اور ہادی کو بتایا کہ وہ اپنی رائفل ٹھیک کرنے کی بجائے پیچھے جائے اور رائفل بدل لائے۔ میجر طارق کی چیخ و پکار سے دشمن کو اندازہ ہو گیا کہ ان کا افسر یہی ہے جو چیخ چیخ کر انھیں ہدایات دے رہا ہے۔ انھوں نے غالباً اپنے کسی ماہر نشانہ باز (Sniper) کو میجر طارق پر نظر رکھنے کو کہا کیونکہ اس کے بعد ان پر مشین گن کے برسٹ کی بجائے اکا دکا گولیوں کا فائر بڑھ گیا۔ گولیاں آتی تھیں اور ارد گرد کے پتھروں سے ٹکرا کر زناٹے کے ساتھ کسی اور رخ چلی جاتی۔ اس عمل کو ریکوشے (Ricochet) کہتے ہیں اور اس کی ایک مخصوص آواز ہوتی ہے جسے ہر فوجی بخوبی پہچانتا ہے کہ یہ آوازیں وہ اس دن سے سننا شروع

کر دیتا ہے جس دن پہلی مرتبہ وہ فائرنگ رینج پر جاتا ہے۔

میجر طارق تن تنہا لڑ رہے تھے اور بیس پچیس افراد کی فائرنگ کی زد میں تھے۔ وہ جونہی اوٹ سے سر اٹھاتے، تڑا تڑ گولیاں برسنے لگتیں۔ ایک دو گولیاں ان کے ہیلمٹ سے ٹکرا کر بھی ریکوشے ہوئیں لیکن اس مرد خدا نے ہمت نہیں ہاری اور میگزین بدل بدل کر فائر کرتا رہا... اور اسی دوران ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پہاڑ چلتے ہوئے اور زمین آسمان اپنی جگہ بدلتے محسوس ہوئے۔ دماغ سن ہو گیا اور انہیں اپنی کچھ خبر نہ رہی۔ کچھ دیر بعد ہوش و حواس بحال ہوئے تو انہیں لگا جیسے کسی نیند سے اٹھے ہوں۔۔۔ ''ہیں! میں سو گیا تھا''۔ انھوں نے حیرت سے سوچا۔ وہ گزشتہ دو دنوں سے مسلسل لڑ رہے تھے اور دو دنوں سے پچھلی رات تک پوری رات پیدل سفر میں رہے۔ سچ ہی کہا ہے کسی نے کہ نیند تو انسان کو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ مشین گن کے ایک برسٹ نے ان کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا اور انھیں احساس ہوا کہ وہ تو حالت جنگ میں ہیں۔

''ایسی حالت میں میں کیسے سو سکتا تھا؟ کہیں بے ہوش تو نہیں ہو گیا تھا۔ گولی وولی تو نہیں لگ گئی تھی کہیں!''۔

انھوں نے ہاتھ پھیر پھیر کر پورے جسم کا جائزہ لیا۔ پورا جسم ٹھیک، خون کا بھی کوئی نشان نہیں۔ اس دوران چونکہ ان کی طرف سے فائرنگ بالکل نہیں ہو رہی تھی، سپاہی ہادی جو رائفل بدل کر ان سے ذرا پیچھے پوزیشن لے چکا تھا، بار بار انھیں پکار کر پوچھتا رہا تھا کہ سب خیریت ہے، آپ ٹھیک ہیں۔ جواب نہ پا کر آگے آیا۔ اس نے دیکھا کہ ہیلمٹ میں ایک سوراخ ہے اور ہیلمٹ کے نیچے سے سر کی پچھلی جانب سے خون رس رہا ہے۔ سپاہی ہادی نے ان کا ہیلمٹ اتارا تو جمع شدہ خون بہہ نکلا اور پورا چہرہ خون سے لت پت ہو گیا۔

میجر طارق کا خون رائیگاں نہیں گیا جب دشمن نے اپنی تمام تر توجہ انھیں ٹھکانے

لگانے پر مرکوز کر رکھی تھی تو وہ اپنی اطراف سے غافل ہو گئے اور وہ پارٹیاں جو نالے اور عقب کی طرف بھیجی گئی تھیں، دشمن کے سر پر پہنچ گئیں۔ انہیں اس وقت پتہ چلا جب وہ چوٹی پر پہنچ کر ان پر فائر کھول چکے تھے۔ ان کے سربراہ نے جو ایک میجر تھا، بھاگنے کی کوشش کی لیکن پیٹھ پر گولی کھا کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں اس کے نمبر دو نے جو ایک کپتان تھا، زیادہ دلیری سے مقابلہ کیا اور لڑتا رہا۔ لیکن اس کی کوئی پیش نہ چلی اور وہ بھی مارا گیا۔ عاقل پوسٹ پھر سے پاک فوج کے قدموں تلے تھی۔ لیفٹیننٹ معاذ نے باآواز بلند میجر طارق کو آواز دی اور ہاتھ سے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے پکارا، ''سر! پوسٹ ری کیپ چرڈ۔ آل اوکے''۔

میجر طارق نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا، کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کی وجہ سے آواز نہ کھل سکی۔ ان کا سر ڈھلک گیا۔ سپاہی ہادی نے نائیک عمر کو آواز دی اور بتایا کہ میجر صاحب کے سر میں گولی لگی ہے، وہ آگے آجائے۔ نائیک عمر آگے آیا۔ دونوں نے سہارا دیا۔ میجر طارق نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زخم کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو آدھی انگلی زخم میں چلی گئی۔ فوجی جانتے ہیں کہ سر کا زخم کتنا مہلک ہوتا ہے، اگر میدان جنگ میں کہیں دو چار زخمی اکٹھے پڑے ہوں اور خوش قسمتی سے کوئی ایمبولینس آجائے لیکن اس میں جگہ کم ہو تو جس کے سر میں زخم آیا ہو، اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بچنے کی امید کم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو، بازو زخمی ہو، پیٹ کی بھلے سے انتڑیاں باہر آگئی ہوں، ان سب کے بچنے کا امکان ہوتا ہے، سو انھیں ترجیح دی جاتی ہے۔

میجر طارق خوش قسمت تھے کہ ان کا زخمیوں سے مقابلہ نہیں تھا، لیکن ان کا کہنا ہے، ''میں نہیں جانتا کہ اس خوش قسمتی پر مجھے خوشی ہے یا افسوس، اس لئے کہ جب آدھی انگلی زخم کے اندر چلی گئی تو مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ میں شہید ہو رہا ہوں اس لیے مجھے بالکل درد محسوس نہیں ہو رہا۔ جب میں اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر اپنا جائزہ لے

رہا تھا تب بھی سر کی طرف خیال نہیں گیا کہ درد بالکل نہیں تھا اور جب انگلی زخم میں داخل ہوئی تب بھی میں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور درود شریف پڑھا اور پورے سکون سے اس فانی دنیا کو خیر باد کہنے کے لیے تیار ہو گیا۔

عجب چیز ہے لذت آشنائی!

نائیک عمر دین اور سپاہی ہادی نے انہیں اٹھانے کی کوشش کی تو عالم غنودگی سے نکلے۔ انہوں نے ہاتھوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی تو بایاں بازو بے جان پایا۔ ساتھیوں کی مدد سے کھڑے ہوئے تو بائیں ٹانگ بھی شل تھی۔ نائیک عمر دین اور سپاہی ہادی انہیں سہارا دیتے ہوئے پیچھے لے چلے تو انہوں نے کہا'' فائر بیس والے تمام آدمیوں کو عاقل پوسٹ پر بھیج دو۔ تمام مشین گنیں بھی آگے جائیں اور معاذ کو کہنا کہ جلدی جلدی اپنی پوزیشنیں ٹھیک کر لے، دشمن کی طرف سے جوابی حملے کے لیے تیار رہے''۔

نائیک عمر دین یہ ہدایات پہنچانے کے لیے فائر بیس کی طرف چلا گیا اور میجر طارق کو ایک پتھر پر بٹھا دیا گیا۔ جہاں سے وہ عاقل پوسٹ پر ہونے والی کارروائی دیکھتے رہے۔ پھر ساتھیوں کی مدد سے وہ ساڑھے چار گھنٹے پیدل چل کر بیس کیمپ پہنچے جہاں نرسنگ اسسٹنٹ شفاعت علی نے ان کی مرہم پٹی کی۔ زخم دھو کر جب وہ پٹی کرنے لگا تو میجر طارق حیران کہ اس نے گولی کو چھوا تک نہیں۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو تو سہی بلٹ اندر تو نہیں ہے۔ نرسنگ اسسٹنٹ خود بھی ایک جی دار انسان تھا، ملنسار، خوش طبیعت، ہمہ وقت مستعد، ہر دم تیار، کارگل اپریشن ہی میں بعد ازاں اس کا پیر ضائع ہوا۔ اپنی دلیری اور خدمت پر اسے تمغہ جرات دیا گیا، یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے میجر طارق کو تسلی دی'' سر! گولی اندر ہوتی تو آپ یہاں تک نہ پہنچتے''۔

معلوم ہوا کہ گولی ہیلمٹ کے ایک سرے کو چیرتی ہوئی، سر کے بالائی حصے کو

زخمی کر کے دوسرے سرے سے گزر گئی۔ اگر اندر رہ جاتی تو آج ہم میجر طارق کو شہید کے لقب سے یاد کر رہے ہوتے۔ ہیلمٹ کا جائزہ لیا تو واقعی اس میں دو سوراخ تھے اور مزید گولیوں کے بے تحاشا نشانات۔ آج کل میجر طارق اپنے اس ہیلمٹ کی تلاش میں ہیں جو وہیں کہیں عاقل پوسٹ اور ''حسن رج'' کی بلندیوں کے درمیان رہ گیا۔ شاید کوئی اٹھا لایا ہو کہ کنٹرولڈ سٹور کی گنتی تو پوری رکھنی ہوتی ہے نا! اور سٹیل ہیلمٹ کنٹرولڈ سٹور آئٹمز میں سے ہے!!



طویل ترین دن

سیکرٹری دفاع لیفٹیننٹ جنرل (ر) افتخار علی خان کا کمبائنڈ ملٹری ہسپتال کے ڈاکٹروں سے نو بجے کا وقت طے تھا۔ انہیں غذا کی نالی اور معدے میں درد کی شکایت تھی۔ کافی عرصہ بے سود علاج کے بعد ڈاکٹروں نے انڈوسکوپی کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے جنرل افتخار سے کہا کہ وہ اپنی سہولت کے مطابق کوئی تاریخ رکھ لیں، اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ انڈوسکوپی کے بعد باقی دن وہ فارغ ہوں۔ انہیں مسکن ادویات دی جاتی تھیں اور ضرورت تھی کہ انڈوسکوپی کے بعد کم از کم ایک دن وہ مکمل آرام کریں۔

تو ۱۲ اکتوبر کا دن طے ہوا تھا۔ سیکرٹری دفاع کی ملاقاتیں اور دیگر مصروفیات منسوخ کر دی گئی تھیں۔ وزیر اعظم نواز شریف اس دن شجاع آباد جا رہے تھے جہاں انہیں کسی جلسے سے خطاب کرنا تھا۔ کوئی اور ان کی مصروفیات میں مخل ہو نہیں سکتا تھا تو انہوں نے سوچا ۱۲ اکتوبر مناسب دن رہے گا۔ ان کے اپریشن کے لیے تو شاید یہ مناسب دن تھا لیکن پورے ملک میں جو اپریشن اس دن ہوئے، ان کے لحاظ سے یہ طویل ترین دن تھا کہ جس کے سائے آنے والے کئی برسوں تک محیط تھے۔

وہ کمبائنڈ ملٹری ہسپتال پہنچے تو سرجن جنرل آف پاکستان آرمی ڈاکٹر لیفٹیننٹ

جنرل ارشد اور ڈائریکٹر جنرل میڈیسن، میجر جنرل عظمت رشید نے ان کا استقبال کیا اور انہیں سیدھا اپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ ان کے بیٹے اویس اور وزارت دفاع کے ایک افسر باہر ٹھہرے رہے۔ انڈوسکوپی کا عمل مکمل ہوا تو ڈاکٹروں نے اویس کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والد کو گھر لے جائیں اور انھیں مکمل آرام کرنے دیں۔ جنرل افتخار اس وقت بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ ان کی رہائش ایوب نیشنل پارک روڈ پر تھی۔ گاڑی جب پورچ میں پہنچی تو ان کی آنکھ کھلی۔ ان کی اہلیہ اور بیٹے نے سہارا دے کر انہیں بیڈ روم میں پہنچایا۔

ان پر گہری غنودگی طاری تھی۔ چند لمحوں بعد وہ گہری نیند سو گئے۔



شجاع آباد

شجاع آباد کے جلسے میں کی جانے والی تقریر، وزیر اعظم نواز شریف کے سیاسی کیریر کی مختصر تقریر تھی۔ جلسے کا اہتمام ایک ہائی سکول میں کیا گیا تھا۔ سٹیج پر وزیر اعظم کی نشست کے بالکل قریب ایک ٹیلیفون رکھا گیا تھا جو ہاٹ لائن سے منسلک تھا۔ شجاع آباد جیسے دور دراز علاقے میں ٹیلیفون کا ایسا اہتمام غیر معمولی بات تھی کہ وزیر اعظم نے وہاں تھوڑی دیر ہی ٹھہرنا تھا۔ شاید کوئی غیر معمولی بات ہونے والی تھی جس پر فوری توجہ کی ضرورت تھی اور جسے مؤخر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

توقع کے عین مطابق، جلسے کے دوران ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت رکن قومی اسمبلی جاوید علی شاہ تقریر کر رہے تھے۔ وزیر اعظم نے خود ٹیلیفون اٹھایا اور تقریباً ڈیڑھ منٹ تک کسی سے بات کی۔ اس کے بعد ہر کام عجلت میں کیا گیا۔ وزیر اعظم نے اپنے ملٹری سیکرٹری کو قریب بلایا، اسے ایک چٹ پر کچھ لکھ کر دیا اور کان میں سرگوشی کی۔ ملٹری سیکرٹری نے کہیں فون ملانا شروع کر دیا۔ سٹیج سیکرٹری کو بلا کر کچھ ہدایات دی گئیں۔ دوسری تمام تقریریں منسوخ کر دی گئیں اور براہ راست وزیر اعظم کو

خطاب کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے صرف چند منٹ خطاب کیا اور اس خطاب میں بھی ان کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔ انہوں نے کہا کہ کچھ لوگ مخصوص ایجنڈے کے ساتھ ان کی حکومت گرانے کے درپے ہیں لیکن حکومت مضبوط ہے اور انہیں دھمکیوں سے مرعوب نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ ملک دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے اور کوئی دشمن پاکستان کو میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ انہوں نے کاشتکاروں کے لیے کپاس کی چالیس کلوگرام کی پھٹی پر ڈیڑھ سو روپے کی امداد کا اعلان کیا۔ اس طرح کپاس کی قیمت خرید ۸۲۵ روپے فی چالیس کلوگرام ہو گئی۔ اس اعلان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا کہ سامعین میں زیادہ تر کاشتکار ہی شامل تھے۔

تقریر کے فوراً بعد وزیر اعظم سٹیج سے اترے اور سیدھے اپنی کار کی طرف چلے۔ کار کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے اپنے ملٹری سیکرٹری سے پوچھا، ''کچھ ہوا؟''

''نو سر! آئی ایم سوری'' ملٹری سیکرٹری کا جواب تھا۔

ملتان ایئرپورٹ پر الوداعی رسمیں مختصر کر دی گئیں۔ وزیر اعظم جہاز میں سوار ہوئے اور جہاز اسلام آباد کی طرف پرواز کر گیا۔



راولپنڈی

وزیر اعظم ہاؤس سے کئی بار بیگم افتخار علی خان کو کہا گیا کہ وہ اپنے شوہر کو جگائیں، ان سے ضروری بات کرنی ہے لیکن انہوں نے ان سنی کر دی۔ انہیں شجاع آباد سے بھی فون آئے لیکن انہوں نے جنرل افتخار کو جگانے سے انکار کر دیا اور فون کرنے والے کو بتایا کہ ان کی انڈوسکوپی ہوئی ہے اور وہ کسی سے بات نہیں کر سکتے، دواؤں کے زیر اثر گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ فون کالوں کا تانتا بندھا رہا اور جنرل صاحب کو جگانے پر اصرار بڑھ گیا۔ بالآخر انہیں بتایا گیا کہ معاملہ بہت نازک ہے۔ وہ اپنے شوہر کو جگائیں اور ایئرپورٹ بھجوائیں جہاں وزیر اعظم شجاع آباد سے واپسی پر

ان سے فوری ملاقات کریں گے۔

جنرل افتخار کو جگایا گیا۔ غنودگی ہی کی حالت میں انہیں لباس تبدیل کرا کے گاڑی میں بٹھایا گیا اور ایرپورٹ بھیج دیا گیا۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ان کے ائرپورٹ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی وزیراعظم کا طیارہ لینڈ کر گیا۔ علیک سلیک کے بعد وزیراعظم نے جنرل افتخار کو اپنے ساتھ کار میں بیٹھنے کو کہا۔ کار کی طرف جاتے ہوئے، وزیراعظم نے اپنے پرسنل سیکرٹری سعید مہدی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ اس ہجوم میں گم تھے جو وزیراعظم کے استقبال کے لئے جمع تھا۔ چنانچہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ ملٹری سیکرٹری نے سنبھال لی۔ کار، رن وے سے باہر جاتے ہوئے، ہجوم کے قریب سے گزری تو لوگوں نے نعرے لگائے۔ وزیراعظم نے ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کہا۔ وہ شجاع آباد کے جلسے سے بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ انہوں نے جنرل افتخار کو بتایا کہ ملتان اور شجاع آباد میں کتنا والہانہ استقبال ہوا اور کسان، کپاس کی قیمت خرید پر سبسڈی کے اعلان سے کتنے خوش تھے۔ خاموشی کا وقفہ آیا تو جنرل افتخار علی خان نے وزیراعظم کو یاد دلوایا کہ انہوں نے انہیں کسی خاص معاملے پر گفتگو کے لیے ائرپورٹ بلوایا تھا۔

"کیا آپ جنرل طارق پرویز کے معاملے پر گفتگو کرنا چاہتے تھے؟" جنرل افتخار نے پوچھا۔ (جنرل مشرف نے ان اطلاعات پر کہ کوئٹہ کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز نے ان سے پوچھے بغیر، وزیراعظم سے ملاقات کی ہے، انہیں جبری طور پر ریٹائر کر دیا تھا۔ جنرل طارق نے وزیراعظم سے ملاقات کی تردید کی تھی)۔

"نہیں اس معاملے کو بھول جائیں۔ میں نے کسی اور کام کے لیے بلایا تھا"۔

"جی میں سن رہا ہوں"۔

"جنرل صاحب آپ نے ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ ایک نوٹیفکیشن جاری کر دیں۔ جنرل پرویز مشرف ریٹائر، لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کو ترقی دے کر فل جنرل

بنا دیا گیا ہے اور انہیں نیا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا گیا ہے"۔

جنرل افتخار کو، جن پر انڈوسکوپی کے دوران دی گئی دواؤں کی وجہ سے ابھی تک قدرے غنودگی طاری تھی، اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے سر کو جھٹکا، ایک جھرجھری لی اور وزیراعظم کی طرف پوری توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا "سر! معاف کیجیے۔ آپ نے کیا کہا؟"

وزیراعظم نے جو کہا تھا دہرا دیا۔ جنرل افتخار نے انہیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا فیصلہ اٹل تھا۔ جنرل افتخار نے پوچھا، "آپ نے اباجی یا اپنے بھائی شہباز شریف سے مشورہ کیا ہے"۔

"نہیں۔ مشورے کا وقت گزر چکا ہے۔ انہیں تو بتانا بھی نہیں ہے۔ آپ کو جو کہا گیا ہے پلیز ویسا ہی کریں"۔

"کیا میں اس فیصلے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"کئی وجوہات ہیں۔ وہ میرے خلاف باتیں کرتے رہے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ امن و امان کی صورت حال بہتر نہیں ہے"۔

وزیراعظم کا اشارہ ان ریمارکس کی طرف تھا جو جنرل پرویز مشرف نے چین کی پچاسویں سالگرہ پر چینی سفیر کی طرف سے دیے گئے استقبالیے کے موقع پر صحافیوں سے بات چیت کے دوران دیے تھے۔ جنرل مشرف نے یہ بھی کہا تھا کہ ملک کی معاشی صورت حال ابتر ہے اور اسے بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی تھی کہ حکومت اس سلسلے میں بھرپور کوشش کرے گی۔

اسی طرح دیوار برلن گرنے اور جرمنی کے اتحاد کا دن منانے کے سلسلے میں جرمن سفیر ہانس جوشیم ڈائر کی طرف سے دیے گئے استقبالیے کے موقع پر صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے ۵ا اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جنرل مشرف نے کہا تھا کہ امن و امان کی

صورت حال خراب ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ حکومت اسے بہتر بنانے کی کوشش کرے گی۔

یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ صحافی کسی اہم شخصیت سے کسی ایسے موضوع پر کچھ نہ کچھ اگلوانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ صحافیوں کی دلچسپی اس میں ہوتی ہے کہ وہ ایسی بات کہلوا لیں جس سے ان کی سٹوری بن جائے۔ بہت کم لوگوں کو اس کے مضمرات اور نتائج سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس طرح کے ریمارکس کی سنگینی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ان سے کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ وزیراعظم جنرل مشرف کے ریمارکس پر مشتعل تھے اور ان کے نزدیک یہ بے موقع اور نامناسب تھے۔

"لیکن انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ حکومت ان معاملات کو بہتر بنانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے"۔ جنرل افتخار نے دلیل دی۔

"آپ جھجک رہے ہیں یا فوج کی حمایت کر رہے ہیں؟" وزیراعظم نے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس معاملے میں آپ جو بھی فیصلہ کریں، آپ کو اس کا اختیار ہے۔ میں صرف یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ شاید یہ موقع مناسب نہیں ہے"۔

وزیراعظم نواز شریف کے لئے کسی چیف کی برطرفی یا تقرری کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ جب تک آئین میں آٹھویں ترمیم موجود تھی (جو جنرل ضیاء الحق نے کی تھی) مسلح افواج کے سربراہوں کی تقرری یا برطرفی کا اختیار صدر کے پاس تھا لیکن اس کی منسوخی کے بعد یہ اختیار وزیراعظم کے پاس آ گیا تھا اور نواز شریف بر بنائے عہدہ اس سے پہلے چھ بار یہ اختیار استعمال کر چکے تھے۔ جب جنرل جہانگیر کرامت نے اس وقت کی صورت حال پر سخت تنقید کی تھی اور سیکورٹی کونسل کے قیام کی تجویز دی

تھی تو انہیں استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا تھا۔ جنرل مشرف کو ان کی جگہ نیا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا گیا تھا۔ لیفٹیننٹ جنرل علی قلی خان اور لیفٹیننٹ جنرل خالد نواز جنرل مشرف کے کورس میٹ تھے لیکن ان سے سینئر تھے۔ جنرل مشرف کی تقرری کے بعد انہوں نے باوقار انداز میں فوج چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور مستعفی ہو گئے۔ جنرل مشرف جس کورس کے ساتھ پاس آؤٹ ہوئے تھے، بڑا خوش قسمت ثابت ہوا۔ کورس کے دوران ہی علی قلی خان سینڈھرسٹ اکیڈمی کے لئے منتخب کئے گئے اور انہوں نے باقی تربیت انگلینڈ میں مکمل کی۔ شبیر شریف شہید بٹالین سینئر انڈر آفیسر تھے جو کسی کیڈٹ کے لیے سب سے سینئر اپوائنٹمنٹ ہوتی ہے۔ انہوں نے شمشیر اعزاز حاصل کی اور سب سے پہلے نمبر پر پاس آؤٹ ہوئے۔ بعد ازاں وہ پاک فوج کے سب سے زیادہ اعزاز یافتہ سپاہی کہلائے کہ پاکستان ملٹری اکیڈمی سے انہوں نے شمشیر اعزاز حاصل کی تھی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں زبردست شجاعت پر انہیں ستارۂ جرات دیا گیا اور ۱۹۷۱ء میں سلیمانکی سیکٹر میں جرات و بہادری کی نئی داستانیں رقم کرنے پر انھیں شجاعت کے اعلیٰ ترین اعزاز نشان حیدر سے نوازا گیا۔ ان کے بعد پاس آؤٹ ہونے والے افضل تھے۔ وہ کمپنی سینئر آفیسر تھے اور شمشیر اعزاز کے لیے ان کا شبیر شریف سے سخت مقابلہ تھا۔ سروس کے دوران وہ کرنل کے عہدے سے آگے نہ جا سکے۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا جب وہ پاکستان سٹیل ملز کے چیرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ پرویز مشرف بٹالین جونیئر انڈر افسر تھے اور فلیگ پارٹی کا حصہ تھے جو پاسنگ آؤٹ کے وقت قومی پرچم اور دوسرے علم اٹھائے ہوئے ہوتی ہے۔ فوج کا سربراہ مقرر ہونے کے وقت وہ فوج میں تیسرے نمبر پر تھے۔ جنرل علی قلی خان اور جنرل خالد نواز کے مستعفی ہونے کے بعد وہ پہلے نمبر پر آ گئے۔

تو ہم وزیراعظم نواز شریف کے مسلح افواج کے سربراہوں کی تقرری اور برطرفی کی بات کر رہے تھے۔ بحریہ کے سربراہ پر فرانس سے اگوستا آبدوز کی خریداری کے

بارے میں جب پریس نے شدید تنقید کی تو ان سے استعفیٰ لے لیا گیا اور ان کی جگہ ایڈمرل فصیح بخاری بحریہ کے نئے سربراہ مقرر کیے گئے۔ جب جنرل مشرف کو چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا اضافی چارج دیا گیا تو ایڈمرل فصیح بخاری نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ایئر مارشل عباس خٹک کی ریٹائرمنٹ پر وزیراعظم نواز شریف نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایئر مارشل پرویز مہدی قریشی کو پاک فضائیہ کا نیا سربراہ مقرر کیا تھا۔ گویا وزیراعظم نواز شریف کے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں تھا، انہوں نے جنرل افتخار سے کہا،

”میں نے اس معاملے پر کافی سوچ بچار کی ہے۔ اس میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔ بس آپ نوٹیفکیشن جاری کر دیں“۔

وزیراعظم کو اپنے ارادے میں اٹل پا کر جنرل افتخار نے بڑی ملائمت سے کہا کہ نوٹیفکیشن جاری کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اس بارے میں تحریری احکامات دیے جائیں۔ اس وقت تک وہ پرائم منسٹر ہاؤس پہنچ چکے تھے۔ گاڑی سے نکلتے ہوئے وزیراعظم نے اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ وہ جنرل افتخار کو تحریری حکم دے دیں۔ پرائم منسٹر ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وزیراعظم نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنرل افتخار سے کہا کہ وہ وہاں تشریف رکھیں۔“ اور کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کریں“۔ وزیراعظم نے اپنے دفتر کی طرف جاتے جاتے ہدایت کی۔ کسی نے وزیراعظم کو بتایا کہ ان کے بھائی شہباز شریف اور چوہدری نثار علی خان کب سے ان سے ملاقات کے منتظر ہیں۔ وزیراعظم نے کہا کہ وہ کسی سے نہیں ملیں گے۔ وہ کسی اور اہم معاملے کو پہلے نبٹانا چاہتے تھے۔

جنرل افتخار ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں تنہا بیٹھے تھے۔ وہ تسلسل کے ساتھ سگریٹ پینے کے عادی ہیں اور پرائم منسٹر ہاؤس میں سگریٹ نوشی منع ہے۔ وہ اپنے سگریٹ کیس اور لائٹر کو ہاتھوں میں لئے الٹ پلٹ کرتے رہے اور لاپرواہی سے

کونے میں دھرا ٹیلیویژن دیکھتے رہے۔

تقریباً یہی وقت ہوگا جب اس وقت کے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کو وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر جاوید کی طرف سے ٹیلیفون کال وصول ہوئی۔ انہیں بتایا گیا کہ وزیراعظم فوری طور پر ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ جنرل ضیاء الدین کا پہلے ہی سے پرائم منسٹر ہاؤس جانے کا ارادہ تھا۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف نے دوپہر کو فون پر ان سے رابطہ کیا تھا اور انہیں پرائم منسٹر ہاؤس آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ پنجاب میں امن و امان کی صورت حال کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ ان کا چھ بجے ملنے کا پروگرام تھا۔ وزیراعظم کے بلاوے کے بعد جنرل ضیاء الدین نے ذرا پہلے جانے کا فیصلہ کیا۔

پرائم منسٹر ہاؤس پہنچنے پر انہیں بتایا گیا کہ جنرل مشرف کو برطرف کر کے انہیں چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا جا رہا ہے۔ وزیراعظم نواز شریف نے جنرل ضیاء الدین کی موجودگی ہی میں وہ فائل منگوائی جس میں مشرف کی برطرفی اور لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کی ترقی اور تقرری کے احکامات موجود تھے۔ انہوں نے چند لمحے اس فائل کی ورق گردانی کی، پھر جنرل ضیاء کو انتظار کرنے کو کہا اور خود صدر پاکستان جسٹس (ریٹائرڈ) رفیق تارڑ کی طرف چلے گئے۔

جنرل ضیاء الدین کو بطور چیف آف آرمی سٹاف، اپنی تقرری کی قطعاً کوئی امید نہیں تھی۔ ان کی ریٹائرمنٹ میں صرف چھ ماہ باقی تھے اور وہ پوری سنجیدگی سے ریٹائرمنٹ کے بعد کسی مصروفیت کی تلاش میں تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ضروری نہیں انسان کو مال ہی کی ضرورت ہو۔ جو شخص پوری زندگی بری طرح مصروف رہا ہو، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس سے بیمار پڑنے کا خدشہ رہتا ہے۔ باصلاحیت، فعال شخص کو مصروف رہنے کے لئے کسی نہ کسی کام کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنرل ضیاء الدین بنیادی طور پر ایک انجینئر ہیں اور انہوں نے بڑی مصروف زندگی گزاری تھی،

جب وہ میجر تھے تو انہوں نے شمالی علاقوں کے ایک دور دراز گاؤں گوری کوٹ میں ایک فیلڈ انجینیئر زکمپنی کمان کی تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل ہونے پر انہوں نے تین انجینیئر ز بٹالین، (۲،۱۰۳، اور ۱۰۸) کمان کی تھیں۔ مسلح افواج میں سٹاف اپوائنٹمنٹ پر کام کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے کہ آپ نے دوسروں کے کام کی نگرانی کرنا ہوتی ہے، ان کے کام میں کیڑے نکالنے ہوتے ہیں۔ مختلف یونٹوں کی مشقوں میں رابطے کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں اور کمانڈر کے فیصلوں پر عمل درآمد کروانا ہوتا ہے۔ جبکہ کماندار کی حیثیت سے آپ کو ہر کام کی ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے چاہے وہ کام آپ کی مرضی سے ہوا ہو یا آپ سے پوچھے بغیر۔ فعال اور مستعد کمانڈر ایسا موثر نظام وضع کرتے ہیں کہ ان کی رضامندی کے بغیر کوئی کام نہ ہو۔ کمان پر رہنے کے فائدے بھی بہت ہیں۔ سہولتیں بہت ملتی ہیں اور سب سے بڑی بات غلبہ، برتری، حاکمیت۔ حاکمیت میں نشہ بہت ہے۔ انسان مدہوش ہو جاتا ہے لیکن اس میں مشکلات بھی بہت ہیں۔ آپ کے ماتحت لوگوں میں کوئی بھی، کہیں، کوئی حرکت کرے، اس کی ذمہ داری آپ کو اٹھانا پڑتی ہے۔ انگریزی کا ایک محاورہ ہے کہ فتح کے سرپرست بہتیرے لیکن شکست یتیم ہوتی ہے۔ یہ محاورہ اس وقت لاگو نہیں ہوتا جب آپ کمان پر ہوں۔ ناخوشگوار واقعات کی ذمہ داری بھی آپ کو قبول کرنا ہوتی ہے۔ فوج میں جب پیشہ ورانہ مہارت روبہ زوال اور ذاتی مفادات ترجیح اولین تھے تو ایسے ''فعال'' افسر بھی تھے جو یونٹ کو کم سے کم وقت کے لئے کمانڈ کرتے تھے۔ اعلیٰ عہدے پر ترقی پانے کے لئے ضروری تھا کہ ایک لیفٹیننٹ کرنل کم سے کم تین ماہ کے لئے کسی یونٹ کو کمانڈ کر کے کمانڈ رپورٹ حاصل کرے۔ ''فعال'' افسر تین ماہ کے لئے یونٹ کمانڈ کر کے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے کسی اور اپوائنٹمنٹ پر نکل جاتے تھے۔ جنرل اسلم بیگ نے اپنی سربراہی کے دور میں یہ لازم قرار دیا کہ جو افسر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر پہنچے وہ کم از کم بائیس ماہ تک کمان پر رہے۔ اس کے بغیر اسے فل کرنل یا

بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی کے لئے زیر غور بھی نہیں لایا جائے گا۔

لیفٹیننٹ کرنل ضیاء نے تین بٹالین کمان کیں۔ انجینیئر بٹالین کی کمانڈ، ویسے بھی مشکل کام ہے۔ انفنٹری بٹالین یا ٹینکوں کی آرمرڈ رجمنٹ عام طور پر یکجا ہوتی ہے لیکن انجینیئر ز بٹالین کی کمپنیاں دور دور بکھری ہوتی ہیں اور مختلف علاقوں میں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل ضیاء نے کامیابی سے تین انجینیئر ز بٹالین کمانڈ کیں۔ اس کمانڈ کے اختتام پر انہیں سعودی عرب بھیجنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ وہاں بھی انہیں ایک انجینیئر ز بٹالین کی کمانڈ ملی۔ وہ ایک مستعد اور موثر کمانڈر تھے، ڈسپلن کی پابندی کرنے والے۔ کم گو تھے، لایعنی باتوں سے مجتنب۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے انہیں کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ سعودی عرب سے واپسی پر وہ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ میں انسٹرکٹر تعینات ہوئے۔ ایک اور مشکل کام۔ مستقبل کے بریگیڈیئروں اور جنرلوں کو پڑھانے کے لئے خود بھی وسیع مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے سخت محنت کی اور اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک وہ سینیئر انسٹرکٹر رہے۔ ۱۹۸۶ء میں انہوں نے نیشنل ڈیفنس کالج سے وار کورس مکمل کیا اور اوّل پوزیشن حاصل کی۔ پرویز مشرف اس وقت بریگیڈیئر تھے اور ان کے اساتذہ میں شامل تھے۔ بریگیڈیئر کی حیثیت سے انہوں نے ۱۹۸۸ء میں سیالکوٹ میں ۱۱۵ بریگیڈ کی کمان کی۔ پھر وہ منگلا میں ا کور ہیڈ کوارٹر میں کمانڈر کور انجینیئر ز تعینات ہوئے۔ کمان ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔ بعد ازاں وہ چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ کے پرنسپل سیکرٹری بھی رہے۔ میجر جنرل کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد انہوں نے لاہور میں ایک انفنٹری ڈویژن کی کمان کی۔ ایک انجینیئر کے لئے یہ ایک منفرد اعزاز تھا۔ ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک وہ جی ایچ کیو میں کمبیٹ ڈویلپمنٹ ڈائریکٹوریٹ کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ مزید ترقی پانے پر انہوں نے ایک کور کی کمان کی اور پھر وہ پاک فوج کے ایڈ جوٹنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۹ء میں انہیں ملک کی حساس ترین تنظیم انٹر سروسز انٹیلی

جس کی قیادت سونپی گئی۔ کیا شاندار کیریر ہے۔ وہ مطمئن بھی تھے، خوش بھی۔

چیف آف آرمی سٹاف بننے کے لئے ان میں ہر طرح کی اہلیت موجود تھی لیکن انہیں اس کی قطعاً کوئی امید نہ تھی۔ صرف تین دن پہلے ۹ اکتوبر کو وہ وزیر اعظم نواز شریف سے ملے اور ان سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی درخواست کی (ان دنوں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کی تعیناتی براہ راست وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہوتی تھی)۔ وزیر اعظم نے وجہ پوچھی تو جنرل ضیاء نے بتایا کہ فوجی فرٹیلائزر کے چیرمین کا عہدہ خالی تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے جنرل مشرف سے درخواست کی تھی کہ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں وہاں ایڈجسٹ کر دیا جائے۔ وزیر اعظم نے وعدہ کیا کہ وہ دوبئی سے واپسی پر خود جنرل مشرف سے بات کریں گے اور امید ہے کہ ان کا کام ہو جائے گا۔ اسی رات آئی ایس آئی آفیسرز میس میں جنرل ضیاء کے کورس میٹ افسروں کی ایک ملن تقریب تھی۔ جنرل ضیاء نے اپنے ریٹائرڈ دوستوں کو بتایا کہ بہت جلد وہ ان میں شامل ہو جائیں گے۔

۱۰ اکتوبر کو وزیر اعظم نواز شریف نے جنرل ضیاء کو فون کر کے بتایا کہ وہ کسی ضروری کام سے دوبئی جا رہے ہیں۔ جنرل ضیاء ان کے ساتھ چلیں اور راستے میں انہیں کشمیر اور افغانستان کی صورت حال پر بریفنگ دیں۔ جنرل ضیاء ان کے ساتھ ہو لئے۔ راستے میں انہیں پتہ چلا کہ حکومت دبئی کے ساڑھے چار سو ملین ڈالر پاکستان کے مختلف بنکوں میں موجود ہیں اور وہ اس رقم کو نکالنا چاہتے ہیں۔ وزیر اعظم نے ان سے کہنا تھا کہ وہ یہ رقم نہ نکلوائیں۔ ان کی بات مان لی گئی۔ راستے میں حسب پروگرام جنرل ضیاء نے وزیر اعظم کو کشمیر اور افغانستان کی صورت حال پر بریفنگ دی۔ وزیر اعظم ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنتے رہے۔ اگر ان کا جنرل ضیاء کو نیا چیف آف آرمی سٹاف بنانے کا ارادہ تھا بھی تو اس بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس سفر میں کالم نگار نذیر ناجی اور ان کے بیٹے بھی وزیر اعظم کے ہمراہ تھے۔ جنرل

ضیاء کو سمجھ نہیں آئی کہ ان کے ساتھ جانے کا کیا مقصد تھا۔

جنرل ضیاء ذہن میں ان واقعات کو دہرا رہے تھے جب وزیر اعظم نواز شریف صدر سے ملاقات کے بعد واپس آ گئے۔ جو فائل وہ ساتھ لے کر گئے تھے، اس پر صدر کے دستخط موجود تھے۔ جنرل مشرف کی برطرفی اور نئے چیف آف آرمی سٹاف کی تقرری کے احکامات پہلے ہی قانون کے عین مطابق تھے۔ صدر کے دستخطوں نے انہیں مزید سند جواز عطا کر دی تھی۔

جنرل افتخار کمرے میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ وہ مسلسل سگریٹ پینے کے عادی ہیں اور پرائم منسٹر ہاؤس میں سگریٹ نوشی سختی سے منع ہے۔ جب سگریٹ کی خواہش حد سے بڑھی تو وہ باہر لابی میں آ گئے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ لابی میں ٹہلنے لگے۔ معاون ملٹری سیکرٹری کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ اس سے ملحق ملٹری سیکرٹری کا دفتر تھا۔ انہوں نے جھانکا تو کوئی شخص ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا نظر آیا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گئے اور دیکھا کہ یہ صاحب قومی اسمبلی کے رکن میجر (ریٹائرڈ) نادر پرویز تھے۔ دونوں کیڈٹ کالج حسن ابدال میں اکٹھے رہے اور باہم دوست تھے۔ راجہ نادر پرویز اپنے بھائی لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز کی ریٹائرمنٹ پر برہم تھے۔ جنرل طارق کوئٹہ میں ۱۲ کور کمانڈ کر رہے تھے۔ وہ اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد جنوری ۲۰۰۰ء میں ریٹائر ہونے والے تھے لیکن جنرل مشرف نے انہیں تین ماہ پہلے ہی جبری طور پر ریٹائر کر دیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کا اعلان ۱۸ اکتوبر کو کر دیا گیا تھا جبکہ ریٹائرمنٹ کا حکم ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے موثر ہونا تھا۔ اگرچہ سرکاری نوٹیفیکیشن میں ریٹائرمنٹ کی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی لیکن اس کا سبب جنرل طارق کی جی ایچ کیو سے اجازت لئے بغیر وزیر اعظم سے ملاقات تھی۔ پریس میں یہ بات مشہور کی گئی تھی کہ جنرل نے خود ریٹائرمنٹ کی درخواست کی تھی۔ خود جنرل طارق نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے اس کی تردید کی تھی اور کہا تھا کہ بہت جلد حقائق کا انکشاف

کریں گے۔ لیکن بعد میں انہوں نے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔ اس سے پہلے منگلا کور کے کمانڈر، لیفٹیننٹ جنرل سلیم حیدر کو بھی جنرل مشرف نے انہی وجوہات کی بنا پر کمان سے ہٹا دیا تھا۔

نادر پرویز وزیر اعظم سے اپنے بھائی کی ریٹائرمنٹ پر گفتگو کرنے آئے تھے۔ دونوں آپس میں بات چیت کر رہے تھے جب انہیں برآمدے سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین، وزیر اعظم کے پرسنل سیکرٹری سعید مہدی اور تین چار افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ جب سب نے نشستیں سنبھال لیں تو وزیر اعظم کے پرسنل سیکرٹری سعید مہدی نے اعلان کیا کہ وزیر اعظم نے جنرل مشرف کو برطرف کر کے جنرل ضیاء الدین کو نیا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا ہے۔ کمرے میں موجود لوگوں نے جنرل ضیاء کو مبارکباد دی۔ وہ وردی میں ملبوس تھے اور انہیں اپنے شانوں پر ایک اور پھول کی ضرورت تھی۔ وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈئر جاوید نے اپنے شانوں سے ایک ایک پھول اتارا اور جنرل ضیاالدین کے شانوں پر سجا دیا گیا۔ کور آف انجینئرز میں سے چیف آف آرمی سٹاف بننے والے وہ پہلے افسر تھے۔ اس سے پہلے یہ عہدہ انفنٹری، آرٹلری یا آرمرڈ رجمنٹ کے افسروں کے پاس رہا تھا۔

اس کے بعد کی بات ہے کہ وزیر اعظم کے پرسنل سیکرٹری سعید مہدی نے جنرل افتخار کی موجودگی کو محسوس کیا۔ وہ جنرل افتخار کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ وہ جا سکتے ہیں اور یہ کہ تحریری احکامات انہیں دینے کا انتظام کیا جا رہا ہے اور بہت جلد یہ احکامات ان کے دفتر میں پہنچا دیے جائیں گے۔

جب جنرل افتخار پرائم منسٹر ہاؤس کی بیرونی سیڑھیاں اتر رہے تھے تو انہوں نے اپنے پیچھے سے آوازیں سنیں، "جنرل صاحب پلیز رک جائیں رک جائیں"۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف اور ان کے اپنے بھائی

چوہدری نثار علی خان تیزی سے ان کی طرف لپک رہے تھے۔ دونوں اس نئے فیصلے پر مشتعل تھے۔ شہباز شریف نے جنرل مشرف کو برطرف کرنے کی وجوہات جاننا چاہیں۔ جنرل افتخار نے انہیں کہا کہ بہتر ہو گا کہ یہ بات وہ اپنے بھائی سے پوچھیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہو جائیں گے۔ جنرل افتخار نے کہا کہ دعا کریں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ملک کی بہتری ہو۔

شہباز شریف اور اپنے بھائی چوہدری نثار علی خان کو خدا حافظ کہنے کے بعد جنرل افتخار اپنی کار کی طرف بڑھے۔ ان کے ڈرائیور نے انہیں بتایا کہ فیض آباد میں کسی مذہبی جلوس کی وجہ سے ٹریفک جام ہے۔ اگر وہ اجازت دیں تو گولڑہ کی طرف سے واپس چلیں۔ اجازت ملنے پر ڈرائیور نے جنرل صاحب کو گاڑی میں بٹھایا اور تیزی سے رفتار بڑھا دی۔ جنرل افتخار نے اسے ہدایت کی کہ انہیں واپسی کی کوئی جلدی نہیں۔ وہ رفتار آہستہ رکھے تاکہ وہ اپنے خیالات مجتمع کر کے سوچ سکیں۔

جنرل کے رینک پہننے کے بعد جنرل ضیاء الدین وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری کے دفتر میں بیٹھ کر فون کرنے لگے۔ انہیں سب سے زیادہ تشویش ان نقصانات کے ازالے کی تھی جو سانحہ کارگل کی وجہ سے ہوئے تھے۔ ان کی رائے میں جنرل محمود اور جنرل عزیز اصلاحی اقدامات اٹھانے کے قابل بھی نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے فوری طور پر ان دونوں کو ان کے عہدوں سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۰ کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود اور چیف آف جنرل سٹاف جنرل عزیز سے فون پر رابطہ نہ ہو سکا۔ ان کے لئے پیغام چھوڑے گئے لیکن انہوں نے رابطہ نہیں کیا۔ جنرل ضیاء پاک فوج کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل مسعود سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے جنرل مسعود کو اپنی تقرری کی خبر سنائی اور ہدایت کی کہ فوری طور پر دو پوسٹنگ آرڈر جاری کئے جائیں۔ لیفٹیننٹ جنرل محمود اور لیفٹیننٹ جنرل عزیز کو فوری طور پر ان کے عہدوں سے ہٹا کر ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل سلیم حیدر کو ۱۰ کور کا کمانڈر اور لیفٹیننٹ

جنرل اکرم کو چیف آف جنرل سٹاف مقرر کیا جائے۔

یہ پوسٹنگ آرڈر تو جاری نہیں ہوئے البتہ بات پھیل گئی۔ وہ جو سانحہ کارگل کے ذمہ دار تھے سمجھ گئے کہ اگر نئے احکامات پر عمل ہوا تو انہیں کورٹ آف انکوائری (تحقیقاتی عدالت) یا کورٹ مارشل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کا تحفظ تبھی ممکن تھا جب جنرل مشرف جو سری لنکا گئے ہوئے تھے، بحفاظت واپس آجائیں اور بطور چیف آف آرمی سٹاف کام کرتے رہیں۔ بھارت میں پارلیمنٹ کی سطح پر سانحہ کارگل کی تحقیقات کی گئی تھی اور بہت سے افسر گھر بھیج دیے گئے تھے۔ لائن آف کنٹرول پر نظر رکھنے والے بریگیڈیئر کو بروقت دراندازی کی اطلاع نہ دینے پر برطرف کر دیا گیا تھا۔



کراچی

پانچ بجے شام ۵ کور کے چیف آف سٹاف بریگیڈیئر طارق سہیل پاکستان کے دوسرے شہریوں کی طرح اپنے گھر میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے جب اچانک سپیشل بلیٹن کا اعلان ہوا۔ کچھ دیر بعد خبر آئی کہ جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر دیا گیا اور لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الدین کو جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر نیا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا گیا ہے۔ انہوں نے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی کو فون کیا اور جو کچھ ٹیلویژن پر دیکھا تھا، انہیں بتایا۔ جنرل عثمانی، جنرل مشرف کو لینے ائرپورٹ جانے والے تھے۔ بریگیڈیئر طارق سہیل کے فون کے بعد انہیں پرائم منسٹر ہاؤس سے کسی نے فون کیا اور بتایا کہ وزیراعظم کو ان کے بیٹے کی صحت کے بارے میں بڑی تشویش ہے اور اس کے علاج کے لئے وہ جب چاہیں، انہیں بیرون ملک بھیجا جا سکتا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ پیشکش وزیراعظم کی طرف سے تھی یا کسی نے از خود پہل کرتے ہوئے وزیراعظم کی طرف سے یہ پیشکش کی تھی۔ بہر حال اس پیشکش کا وقت نامناسب تھا۔ جنرل عثمانی نے فون کرنے والے کو بتایا کہ انہیں ضرورت محسوس ہوئی تو

وہ خود وزیراعظم سے بات کرلیں گے۔



راولپنڈی

راولپنڈی میں چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل عزیز اور ۱۰ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمود گالف کھیل رہے تھے جب انہیں نئی صورت حال کی خبر دی گئی۔ دونوں گالف کورس چھوڑ کر جنرل محمود کی رہائش گاہ پہنچے۔ جنرل عزیز نے جنرل عثمانی کو فون کر کے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ جنرل عثمانی نے جنرل عزیز سے پوچھا کہ جنرل مشرف نے کوئی ہدایات دی تھیں کہ نہیں۔ اثبات میں جواب پا کر جنرل عثمانی نے انہیں کہا "پھر ان کی ہدایات پر عمل کرو"۔

کچھ دیر بعد جنرل محمود نے بھی جنرل عثمانی کو فون کیا اور نئی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔ یہ بات حیران کن ہے کہ دونوں جرنیلوں نے جنرل عثمانی سے کیوں بات کی اور کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ان کی رضامندی ضروری کیوں سمجھی۔ وہ سب سے سینئر جنرل بھی نہیں تھے۔ اس وقت سینئر ترین جنرل، لیفٹیننٹ جنرل سعید الظفر تھے جو کوہاٹ میں ۹ کور کے کمانڈر تھے اور اس دن اتفاق سے راولپنڈی ہی میں موجود تھے۔ بعض اوقات جغرافیائی محل وقوع انتہائی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ جنرل پرویز مشرف نے کراچی ہوائی اڈے پر اترنا تھا اور ترپ کے پتے کراچی کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی کے ہاتھ میں آگئے تھے۔ تاریخ ایک موڑ پر پہنچ رہی تھی اور عین درمیان میں ۵ کور کے کمانڈر جنرل مظفر عثمانی کھڑے تھے۔

ان پر منحصر تھا کہ وہ تاریخ کا دھارا کس طرف موڑتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حکومت کی تبدیلی میں ۵ کور نے کوئی کردار ادا کیا ہو۔ یہ راولپنڈی میں واقع ۱۰ کور کا "استحقاق" ہی رہا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ ۵ کور کو کلیدی کردار مل رہا تھا اور سارے کے سارے اہم پتے لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی کے

ہاتھ میں تھے۔ ان کے اقدام نے آنے والے دنوں پر گہرے اثرات مرتب کرنے تھے اور بد قسمتی سے یہ منفی اثرات ثابت ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہیں جنرل ضیاء الدین کا ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں ترقی دے کر جنرل بنا دیا گیا ہے اور نیا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کیا گیا ہے۔ انہوں نے جنرل عثمانی کو ہدایت کی کہ وہ ائر پورٹ پر جنرل مشرف کا استقبال کریں اور انہیں پورے پروٹوکول کے ساتھ آرمی ہاؤس میں لائیں (جہاں عام طور پر چیف آف آرمی سٹاف، کراچی کے قیام کے دوران ٹھہرتے ہیں)۔ انہوں نے بمشکل فون رکھا ہی تھا کہ پرائم منسٹر ہاؤس سے ایک اور فون آیا۔ اس مرتبہ وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر جاوید فون پر تھے۔ انہوں نے جنرل عثمانی کو بتایا کہ جنرل مشرف کو کسی قسم کا پروٹوکول دینے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ انہیں آرمی ہاؤس میں محبوس کر دیا جائے۔ جنرل عثمانی کو ہر صورت میں ائر پورٹ تو پہنچنا ہی تھا۔ وہ وردی پہن چکے تھے، ائر پورٹ روانہ ہو گئے۔

جب وہ راستے میں تھے تو انہیں جنرل محمود کی طرف سے پھر ٹیلیفون آیا۔ جنرل عثمانی نے پوچھا کہ انہوں نے اب تک کیا اقدامات کیے ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ جنرل پرویز مشرف کے اترنے اور ان کے مقدر کے فیصلے کے انتظار میں تھے۔ اس یقین دہانی کے بعد کہ جنرل عثمانی ان کے ساتھ ہیں، انہوں نے راولپنڈی میں کارروائی کا آغاز کیا۔ جنرل عثمانی نے ملیر گیریژن کے جنرل آفیسرز کمانڈنگ، میجر جنرل افتخار کو فون کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ فوری طور پر ائر پورٹ پہنچیں، اپنے فوجی دستوں کو حرکت میں لائیں، ائر ٹریفک کنٹرول کا چارج سنبھال لیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ جنرل پرویز مشرف بحفاظت اتر آئیں۔ ائر پورٹ پہنچنے پر جنرل مظفر عثمانی نے دیکھا کہ انسپکٹر جنرل پولیس، رانا مقبول اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل اکبر ارائیں پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ جنرل عثمانی نے سنا کہ آئی جی اپنے نائب کو ہدایت دے رہے ہیں کہ وہ ائر پورٹ کا کنٹرول سنبھال لیں۔ ڈی آئی جی کو اس میں تامل تھا۔ جنرل عثمانی

کو دیکھ کر انہوں نے سمجھا کہ فوجی دستے بھی ائر پورٹ کے ارد گرد موجود ہیں اور اگر پولیس نے کنٹرول سنبھالنے کی کوشش کی تو پولیس اور فوج میں جھڑپ نہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت فوجی دستے ائر پورٹ پر موجود نہیں تھے۔ جنرل عثمانی نے آئی جی کی بات سن کر دوبارہ میجر جنرل افتخار سے رابطہ کیا اور انہیں جلد از جلد ائر پورٹ پہنچنے کی ہدایت کی۔ اس کے فوراً بعد وہ ائر پورٹ پہنچ گئے اور انہوں نے خود ائر ٹریفک کنٹرول ٹاور کا انتظام سنبھال لیا۔ ائر ٹریفک کنٹرولر، یوسف عباس نے بتایا کہ انہیں ہدایت ملی ہے کہ وہ جنرل مشرف کا جہاز نواب شاہ بھجوائیں۔ جنرل افتخار نے اپنا پستول نکالا، ائر کنٹرولر کی کنپٹی پر رکھا اور اسے ہدایت کی کہ وہ پائلٹ سے ان کی بات کروائیں۔ دریں اثناء جنرل افتخار کے سٹاف آفیسر نے جنرل عثمانی کے پاس جا کر انہیں اطلاع دی کہ طیارے کو نواب شاہ بھیجنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ جنرل عثمانی ایک دن پہلے ہی حیدر آباد اور نواب شاہ کے یونٹوں کا معائنہ کر کے آئے تھے اور انہیں ٹھیک ٹھیک معلوم تھا کہ کون سا یونٹ کہاں مقیم ہے۔ انہوں نے رینجرز کے ایک یونٹ کے ونگ کمانڈر اور ایک انفنٹری بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر سے رابطہ کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ فوری طور پر نواب شاہ پہنچیں، ائر پورٹ کا کنٹرول سنبھالیں اور جنرل مشرف کے بحفاظت اترنے کا انتظام کریں۔ وہ فوری طور پر ائر پورٹ روانہ ہو گئے۔ فاصلہ زیادہ تھا، وہ کتنی ہی تیز رفتاری سے چلتے، ان کا بر وقت ائر پورٹ پہنچنا محال تھا۔ سول پولیس پہلے ہی ائر پورٹ کا گھیرا ڈال چکی تھی اور انہیں حکم تھا کہ جنرل پرویز مشرف کو ائر پورٹ اترتے ہی گرفتار کر لیں۔ ایک وی وی آئی پی جہاز جس کا رجسٹریشن نمبر AP-BEH تھا، پہلے ہی ائر پورٹ پر موجود تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ اس جہاز میں کوئی کانفرنس ٹیبل لگائی جانی تھی۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی تاریخ میں پی آئی اے کے لیٹر ہیڈ پر پاک فضائیہ کے ایک افسر کو یہ ہدایت دی گئی تھی "اس جہاز کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو صبح نو بجکر پینتیس منٹ پر چیک-اے کے لیے کراچی ائر پورٹ پر موجود ہونا چاہیے۔ اس

جہاز کو ۱۳ اکتوبر کو صبح نو بجے اسلام آباد کے لئے پرواز کرنا ہے۔ وزیر اعظم کے ملٹری سیکرٹری کی ہدایت کے مطابق ایک نئی کانفرنس ٹیبل بنوائی گئی تھی جسے جہاز میں لگانا تھا۔ ڈویلپمنٹ انجینئرنگ شعبے کے چیف انجینئر مسٹر اطہر حسین انصاری نے جواب دیا تھا، ''براہ مہربانی یہ بات جان لیں کہ میز کی مکمل تنصیب کا کام تبھی مکمل ہو سکتا ہے اگر ۱۳ اکتوبر کو جہاز کی روانگی ایک بجے دوپہر تک موخر کر دی جائے کیونکہ میز کی اوپری سطح اور فریم کی بنیاد کو اپنی جگہ پکڑنے کے لئے کم از کم چوبیس گھنٹے درکار ہوں گے۔ براہ مہربانی بتائیں کہ اس کام کی تکمیل کے لئے جہاز کی روانگی ایک بجے تک موخر کی جا سکتی ہے یا نہیں، ورنہ یہ کام پھر کبھی کیا جا سکے گا''۔

پولیس اور جہاز کا عملہ ۱۲ اکتوبر کو سری لنکا سے آنے والی پرواز پی۔ کے ۸۰۵ کی آمد کا منتظر رہا لیکن اس جہاز نے آنا تھا نہ آیا۔

کراچی کے قائد اعظم انٹرنیشنل ائر پورٹ پر میجر جنرل افتخار ائر ٹریفک کنٹرول ٹاور میں کھڑے تھے اور فلائٹ کنٹرول کے ذمہ دار افسر کو ہدایت دے چکے تھے کہ وہ پائلٹ سے ان کی بات کرائے۔ جب پائلٹ ثروت حسین سے ان کی بات ہوئی تو پتہ چلا کہ کنٹرول ٹاور سے انہیں دوبئی جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کے جہاز میں اتنا ایندھن موجود نہیں ہے کہ وہ دوبئی جا سکیں اور، وہ جہاز کے مسافروں کی جانوں کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ بالآخر انہیں نواب شاہ جانے کو کہا گیا تھا اور وہ نواب شاہ جا رہے تھے۔ جنرل افتخار نے پائلٹ کو بتایا کہ وہ واپس آئیں اور کراچی ائر پورٹ پر اتریں۔ پائلٹ نے جنرل مشرف کو اطلاع دی۔ جنرل مشرف خود کاک پٹ میں آئے اور ائر ٹریفک کنٹرولر سے کہا کہ وہ جنرل افتخار سے ان کی بات کرائیں۔ انہوں نے جنرل افتخار کی آواز پہچان لی لیکن مزید احتیاط کے طور پر ان سے اپنے کتوں کے نام پوچھے، ''ڈاٹ اینڈ بڈی سر''۔ جنرل افتخار نے جواب دیا۔ جنرل مشرف مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ جنرل مظفر عثمانی کہاں ہیں۔

جنرل افتخار نے بتایا کہ وہ بھی ائر پورٹ پر موجود ہیں۔ تمام حالات مکمل کنٹرول میں ہیں اور وہ اطمینان کے ساتھ کراچی اتر سکتے ہیں۔ جنرل مشرف نے پائلٹ سے کراچی اترنے کو کہا۔ جب جہاز کراچی ائر پورٹ پر اترا تو اس میں بمشکل چھ سات منٹ کا ایندھن باقی تھا۔

اس کمرشل فلائیٹ میں پچاس بچے بھی تھے جن کا تعلق درجن بھر ممالک کے زیر اہتمام چلنے والے سکولوں سے تھا۔ کئی کا تعلق پاکستان کے طبقہ اشرافیہ سے تھا۔ پاکستان کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان اور تحریک انصاف کے چیرمین عمران خان کا بھتیجا بھی ان میں شامل تھا۔ ان بچوں اور ان کے ہمراہ اساتذہ کا تعلق امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، جرمنی، فرانس، سوئٹزرلینڈ، سپین، جنوبی افریقہ، جاپان، کوریا اور پاکستان سے تھا۔ ۲۳ طلبہ اور ان کے تین اساتذہ کا تعلق امریکن سکول لاہور سے تھا۔ ۲۰ طلبہ اور ان کے ہمراہ چار اساتذہ انٹرنیشنل سکول کراچی سے متعلق تھے۔ طلبہ کے یہ گروپ جنوبی ایشیا کے سکولوں کی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام پیراکی کے مقابلوں میں شرکت کے لئے گئے تھے اور کئی سونے کے تمغے اور ٹرافی جیت کر آئے تھے۔ وہ جنرل مشرف سے گھل مل گئے اور ان سے آٹو گراف لیتے رہے۔

جہاز رن وے پر رکا، انجن بند ہوئے، سیڑھیاں لگائی گئیں، دروازے کھولے گئے۔ سب سے پہلے جو جہاز سے نمودار ہوئے، جنرل مشرف تھے۔ انہوں نے نیچے دیکھا تو جنرل مظفر حسین عثمانی دو تین مسلح افسروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ نیچے اترے۔ جنرل عثمانی نے انہیں سیلوٹ کیا اور آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ جنرل مشرف ابھی تک گومگو کی حالت میں تھے۔ انہوں نے جنرل عثمانی کو بتایا کہ ان کی اہلیہ بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ کیا وہ بھی طیارے سے باہر آ سکتی ہیں؟ جنرل عثمانی نے اثبات میں جواب دیا اور اپنے سٹاف آفیسر میجر ظفر کو ہدایت کی کہ وہ ان کی اہلیہ کو لے کر آئیں۔ میجر ظفر جہاز پر چڑھ گئے جبکہ جنرل عثمانی جنرل مشرف کو لے کر وی آئی پی لاؤنج میں

آ گئے۔ جنرل مشرف پہلے واش روم میں گئے۔ واپس آئے اور نشست سنبھال لی تو جنرل عثمانی نے مذاقاً کہا ''مجھے ہدایت ملی ہے کہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے''۔ جنرل مشرف پریشان ہو گئے۔ جنرل عثمانی مسکرائے اور بولے کہ وہ بے فکر رہیں کہ حالات قابو میں ہیں۔ دونوں باہر آئے۔ جنرل مشرف اپنی گاڑی میں بیٹھے۔ جنرل عثمانی نے ان کے ساتھ والی سیٹ سنبھالی۔ وہ جب ۵ کور ہیڈکوارٹر کی طرف روانہ ہوئے تو گاڑی پر چیف آف آرمی سٹاف کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ راستے میں جنرل عثمانی نے چیف آف جنرل سٹاف جنرل عزیز اور کمانڈر ۱۰ کور سے رابطہ کیا اور انہیں بتایا کہ جنرل مشرف بخیریت اتر گئے ہیں۔

پرائم منسٹر ہاؤس اور ٹی وی پر جو ہوا اس کی تفصیلات پریس میں آ چکی ہیں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ۱۰ کور کمانڈر جنرل محمود اور وائس چیف آف آرمی سٹاف لیفٹیننٹ جنرل احمد جان اورکزئی نے جنرل ضیاء الدین کو حراست میں لیتے ہوئے کہا ''جنرل پرویز مشرف ابھی بھی چیف آف آرمی سٹاف ہیں''۔ جنرل ضیاء الدین کو ویسٹرج راولپنڈی میں ۱۱۱ بریگیڈ میں لے جایا گیا جہاں وہ ۶۶۰ دنوں تک قید تنہائی میں رہے۔ اور اس دوران ان کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ پانچ مہینوں تک انہیں کوئی اخبار دیا گیا نہ رسالہ۔ ریڈیو نہ ٹیلی ویژن۔ پانچ ماہ کے بعد ان کی اہلیہ اور بیٹے کو ان سے ملنے کی اجازت دی گئی۔



راولپنڈی

سیکرٹری دفاع جنرل (ر) افتخار علی خان گولڑہ کے راستے مال روڈ پر پہنچ گئے تھے جب انہوں نے ایڈیشنل سیکرٹری دفاع میجر جنرل شہزادہ عالم ملک کو فون کر کے انہیں دفتر آنے کو کہا۔ انہوں نے جوائنٹ سیکرٹری دفاع میجر (ر) شوکت نواز کو بھی دفتر بلا لیا۔ ان کی گاڑی فلیش مین ہوٹل سے سیکریٹریٹ نمبر ۲ کی طرف مڑ رہی تھی جب انہیں

اپنے موبائل پر شہباز شریف کی طرف سے فون آیا۔ ان کی آواز میں تشویش تھی۔ انہوں نے بتایا کہ فوجی دستوں نے پرائم منسٹر ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا ہے اور ٹی وی سٹیشن بھی فوج کے گھیرے میں ہے۔

''یہ لوگ کون ہیں؟'' شہباز شریف نے پوچھا۔ جنرل افتخار کو معلوم تھا لیکن انہوں نے جواب نہیں دیا۔ شہباز شریف نے ان سے کہا کہ وہ معلوم کر کے انہیں بتائیں۔ ان دونوں میں طویل عرصے تک رابطہ منقطع رہنا تھا۔ پاکستان کے منتخب وزیر اعظم اور ان کے خاندان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ ایک سوگوار کہانی ہے جس کا تسلسل ہمارے پریس جانے تک جاری ہے۔ راقم الحروف نے جب نواز شریف سے ان کے لندن آفس میں ملاقات کے دوران ۱۲ اکتوبر کے واقعات دہرانے کو کہا تو انہوں نے تمام واقعات ایک فقرے میں سمیٹ دیے ''جب سورج نکلا تو ہم آزاد تھے اور جب غروب ہوا تو ہم پابند سلاسل تھے''۔



کراچی

راقم الحروف ان دنوں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے ۵ کور کے ہیڈکوارٹر میں تعینات تھا اور پریس سے رابطے کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ معمول یہ تھا کہ اگر چیف آف آرمی سٹاف کسی غیر ملکی دورے سے واپس آتے تھے تو کم ہی کراچی ٹھہرتے تھے۔ تازہ دم ہونے کے بعد وہ اسلام آباد چلے جاتے اور اگر کوئی اعلامیہ جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ راولپنڈی میں آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ سے جاری ہو جاتا تھا۔ ہم احتیاطاً دفتر میں موجود رہتے کہ شاید کوئی اعلامیہ پریس کو جاری کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔ ۱۲ اکتوبر کو بھی ہم سول کپڑوں میں ملبوس دفتر میں بیٹھے فائلوں کی ورق گردانی کر رہے تھے کہ ٹیلی ویژن پر جنرل مشرف کی ریٹائرمنٹ اور جنرل ضیاء الدین کی ترقی اور نیا چیف آف آرمی سٹاف مقرر کرنے

کے بارے میں سپیشل بلیٹن جاری ہوا۔ کچھ دیر بعد پاکستان ٹیلی ویژن خاموش ہو گیا۔
ہم نے آئی ایس پی آر ڈائریکٹوریٹ میں کسی افسر سے رابطے کی کوشش کی لیکن کچھ نمبروں سے کوئی اٹھاتا نہ تھا اور کچھ مسلسل مصروف مل رہے تھے۔ کور کمانڈر کی رہائش گاہ فلیگ شاف ہاؤس سے رابطہ کرنے پر پتہ چلا کہ کور کمانڈر جنرل مشرف کو لینے ائر پورٹ گئے ہیں۔ ہم نے جیپ پکڑی اور آرمی ہاؤس پہنچے جہاں جنرل پرویز مشرف کی آمد متوقع تھی۔ وہاں ایک دو افسر موجود تھے لیکن کسی کو خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے جب گاڑیاں آنے کی آوازیں آئیں۔ ہم باہر آئے تو دیکھا کہ جنرل مشرف کی اہلیہ تو موجود ہیں لیکن خود جنرل مشرف نہیں ہیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ کور ہیڈ کوارٹر چلے گئے ہیں۔ ہم تیزی سے دفتر پہنچے۔ سیکورٹی سخت کر دی گئی تھی اور فوجی دستے ہیڈ کوارٹر کے اندر بھی موجود تھے۔ ہم چیف آف شاف بریگیڈیئر طارق سہیل کے دفتر پہنچے جو اندرون ملک اور بیرون ملک سے آنے والی مسلسل ٹیلی فون کالوں میں الجھے ہوئے تھے۔

وہ ایک شریف النفس انسان ہیں۔ پورے سکون اور تحمل سے معاملات کو وہ اس طرح نمٹا رہے تھے جیسے معمول کے کسی کام میں مصروف ہوں۔ ہماری غیر حاضری پر وہ قدرے برہم ہوئے لیکن جب انہیں بتایا گیا کہ ہم آرمی ہاؤس میں تھے جہاں چیف عام طور پر آیا کرتے ہیں تو وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ جنرل مشرف قوم سے خطاب کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں ان کے لئے تقریر لکھنا تھی۔ ہم چونکہ مل نہیں رہے تھے اس لئے پنجاب سے آئے ہوئے ایک میجر جنرل کو تقریر لکھنے کو کہہ دیا گیا تھا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہم ان کے ساتھ بیٹھ جائیں اور تقریر لکھنے میں ان کی مدد کریں۔ ہم نے نرمی سے معذرت چاہی کہ فوج کا ایک اپنا طریق کار ہے۔ ایک کرنل کسی جنرل سے ڈکٹیشن تو لے سکتا ہے اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ ہم نے تجویز دی کہ جب تک جنرل صاحب تقریر لکھیں، ہم اسے نشر کرنے کا انتظام کرتے ہیں کہ آخر اس

میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ تجویز مان لی گئی۔

ہم نے کراچی ٹیلیویژن فون کیا اور ڈائریکٹر کرنٹ افیرز اطہر وقار عظیم سے بات کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ وہ چیف کی تقریر ریکارڈ کرنے کے لئے ایک ٹیم کور ہیڈ کوارٹر پہنچا دیں۔ ان کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے مجھے فون پر پا کر سکھ کا سانس لیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ٹیلیویژن سٹیشن کو فوجیوں نے گھیرے میں لیا ہوا ہے اور وہاں تو کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ انہوں نے درخواست کی کہ ہم خود ٹیلیویژن سٹیشن آئیں، ان کی حالت زار کا اندازہ کریں، ان کی مدد کریں اور ٹیم اپنے ساتھ لے جائیں۔ ان کے لہجے کی تشویش سے اندازہ ہوا کہ ٹیم باہر نہ نکل سکے گی۔ ہم نے جیپ پکڑی اور فوراً ٹی وی سٹیشن روانہ ہو گئے۔ جب ٹی وی سٹیشن پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم تو سول کپڑوں میں ملبوس تھے اور فوجی ہمیں ٹی وی سٹیشن میں داخلے سے روک سکتے تھے۔ ہم نے جیبوں میں اپنا فوجی شناختی کارڈ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ناکام۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ واپس جا کر وردی پہنتے یا شناختی کارڈ لے کر آتے۔ ہم نے سفر جاری رکھا۔ ٹی وی سٹیشن پر پہنچے تو دروازے بند تھے۔ دروازے کے باہر ہم نے جیپ روک دی۔ خوش قسمتی سے ٹی وی کا گھیراؤ کرنے والے فوجیوں کا کمانڈنگ آفیسر ہمیں پہچانتا تھا۔ اس نے ہمیں سیلوٹ کیا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔ جب ہم سٹوڈیوز کے دروازے پر پہنچے تو ڈائریکٹر کرنٹ افیرز اور کئی لڑکوں، لڑکیوں کو منتظر پایا، شاید اطہر وقار عظیم نے ان کو بتا دیا تھا کہ کمک پہنچنے والی ہے۔ انہوں نے ہمیں گھیر لیا اور التجا کی کہ انہیں رہائی دلوائی جائے۔ ہم نے پوچھا کہ وہ سب کیا کر رہے تھے؟ بتایا گیا کہ وہ سب آرٹسٹ تھے اور مختلف ڈراموں اور گیتوں کی ریہرسل کر رہے تھے۔ ہم نے انہیں تسلی دی کہ انہیں کوئی خطرہ نہیں وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن انہوں نے بیک آواز "رہائی" کا مطالبہ کیا۔ شاید آرٹ اور ثقافت کی نازک سرگرمیاں بندوقوں کے سائے تلے پروان نہیں چڑھ سکتیں۔ ہم ان سب کو لے کر صدر دروازے تک پہنچے

اور کمانڈنگ آفیسر سے کہا کہ انہیں جانے دیں۔ اس نے کہا، ''سر حکم یہ ہے کہ کوئی شخص باہر سے اندر آئے نہ اندر سے باہر جائے''۔ ہم نے اپنے اختیارات استعمال کیے۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا تعلق کور ہیڈ کوارٹر سے ہے۔ آپ کو وہیں سے حکم ملتے ہیں نا۔ ہمارا حکم ہے کہ انہیں باہر جانے دو''۔

اس نے مزید بحث نہیں کی۔ دروازے کھول دیے گئے۔ آرٹسٹ یوں نکل کر بھاگے جیسے کب سے کسی جیل میں قید ہوں۔ ہم واپس سٹوڈیوز کی طرف آئے تو اطہر وقار صاحب کو دو ایک آدمیوں کے ساتھ باہر ہی کھڑے پایا۔ انہوں نے کہا کہ ان آدمیوں کو باہر جانے دیا جائے تاکہ کھانے پینے کی اشیاء خرید لائیں کہ ٹی وی کا عملہ کب سے بھوک اور پیاس میں مبتلا ہے۔ ''اور وہ آپ کی کنٹین کہاں گئی؟'' ہم نے پوچھا۔ ''کنٹین والا بہت تیز نکلا۔ فوج کے آنے سے پہلے پہلے اس نے کنٹین بند کی اور بھاگ نکلا''۔ ہم نے انہیں بھی باہر بھجوایا اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ کھانے پینے کی اشیاء لے کر واپس آئیں تو انہیں اندر آنے دیا جائے۔ اب احساس ہوا کہ ہمیں خود بھی بھوک لگ رہی تھی، کھانے کے انتظار میں کام تو ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم اطہر وقار صاحب کے ساتھ اندر گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسلام آباد بات کر کے چینل تو کھلوائیں۔ چند منٹوں میں یہ مسئلہ حل کر دیا گیا۔ جب نشریات شروع ہو گئیں تو میں نے اطہر وقار کو بتایا کہ ایک سلائیڈ چلوا دیں جس پر لکھا ہو کہ چیف آف آرمی سٹاف جلد قوم سے خطاب کریں گے۔ مجھ سے خاص طور پر پوچھا گیا کہ کیا چیف کا ذکر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کیا جائے۔ ہم جب کور ہیڈ کوارٹر سے چلے ہیں تو اس وقت تک فوج نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کرنا کیا ہے۔

''چیف تو مزید چیف نہیں رہے تھے۔ وزیراعظم انہیں برطرف کرنے کے اہل تھے۔ تو اب ان کی حیثیت ہے تو ریٹائرڈ چیف آف آرمی سٹاف کی۔ اصل پوزیشن کیا

ہے؟ اگر ڈی جیور (قانونی حیثیت سے) نہیں تو حقیقی طور پر (ڈی فیکٹو) چیف تو ہیں۔ کور ہیڈ کوارٹر جا کر کسی سے مشورے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہمارے سوال پوچھنے پر جی ایچ کیو میں جج ایڈووکیٹ جنرل برانچ سے رابطہ کیا جانا تھا اور پھر ایک لمبی بحث چھڑ جاتی۔ قوم یہ جاننے کی منتظر تھی کہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہو گیا ہے۔ ہم شاید مارشل لاء کے نفاذ میں تاخیر تو کر سکتے تھے۔ ماضی میں مثال موجود تھی جب چیف نے قومی اسمبلی کے سپیکر کو دعوت دی کہ وہ صدر کا عہدہ سنبھالیں۔

''شاید اب بھی ایسا ہو جائے'' ہم نے سوچا۔

چلیں چیف کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ شاید دانائی غالب آ جائے''۔

ہم نے ہدایت کی کہ سلائیڈ پر صرف یہ لکھا ہو گا کہ چیف آف آرمی سٹاف قوم سے خطاب کریں گے۔ نرمی سے کہا گیا کہ یہ بات لکھ کر دی جائے۔ ہم نے تحریر لکھ دی۔ جب ہمارے ساتھ جانے والی ٹیم اپنا ساز و سامان سمیٹ رہی تھی، ہم نے جو تحریر انگریزی میں لکھ کر دی تھی، اس کا ترجمہ ہمیں دکھایا گیا۔ ہم نے اسے درست قرار دیا لیکن درخواست کی گئی کہ اس پر بھی ہم اپنے دستخط ثبت فرمائیں۔ ہم نے فرما دیے۔ وہ پیشہ ور لوگ تھے لیکن کتنے نارمل محتاط!!

جب ہم ٹی وی کی ٹیم کو لے کر کور ہیڈ کوارٹر پہنچے تو ہمارا دفتر صحافیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی انہوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ہم نے ان سے انتظار کرنے کو کہا۔ پاک بحریہ کے افسر تعلقات عامہ کمانڈر روشن خیال ہماری مدد کو آ گئے تھے۔ ہم نے ان سے اپنا دفتر سنبھالنے کو کہا اور خود چیف آف آرمی سٹاف کے دفتر کی طرف چلے گئے۔ مختصر تبادلہ خیال کے بعد یہ طے پایا کہ تقریر کی ریکارڈنگ کور کمانڈر کے دفتر میں کی جائے۔ بریگیڈیئر طارق سہیل نے اس تقریر کا مسودہ ہمارے حوالے کیا جو اتفاق سے پنجاب سے آئے ہوئے ایک میجر جنرل نے لکھا تھا۔

ہم نے ٹی وی ٹیم کو کور کمانڈر کے دفتر میں چھوڑا کہ وہ اپنے کیمرے اور دیگر سازو سامان نصب کریں اور خود مسودہ پڑھنے ایک خالی کمرے میں چلے گئے۔ یہ خالص فوجی انداز میں لکھا گیا تھا اور اسے نشریاتی تقریر بنانے کے لئے بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ اور وہ خدشے اور وہ وسوسے جو ہمارے ذہن میں کلبلا رہے تھے اور وہ توقعات جو ہم باندھ بیٹھے تھے، تقریر میں سمونے کے لئے بھی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔

ہم سیدھے ریٹائرنگ روم میں گئے جہاں جنرل مشرف دوسرے افسران کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ جنرل عثمانی نے تمام کور کمانڈروں سے جنرل مشرف کی فون پر بات کروا دی تھی اور اب تک وہ اپنی کمان نئے سرے سے قائم کر چکے تھے۔ اس سے پہلے پاکستان کی تاریخ میں کبھی ۵ کور نے حکومت کی تبدیلی کا کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ ہمیشہ ۱۰ کور کا "استحقاق" ہی رہا تھا اور اسی لئے "ہنگامی صورت حال" میں متوقع کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے کمانڈر کا بڑی احتیاط سے انتخاب کیا جاتا ہے۔ جنرل مشرف کو جنرل عثمانی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا جنہوں نے مشکل وقت میں ان کا ساتھ دیا اور چیف آف آرمی سٹاف سے "چیف ایگزیکٹیو" یعنی سیاہ و سفید کا مالک بننے میں مدد دی لیکن اقتدار کے کھیل کے اپنے قواعد ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "انقلاب" سب سے پہلے ناگن کی طرح اپنے بچوں کو نگلتا ہے۔ جنرل عثمانی کو پہلے ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ دے کر کمان سے ہٹایا گیا اور پھر فارغ کر دیا گیا۔

ہم نے جنرل عثمانی کو ایک طرف بلایا اور مسودے کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ انہوں نے فوراً نیا مسودہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے کہا کہ وقت کم ہے، پوری قوم انتظار کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ اگر ہم نے تقریر لکھ بھی لی تو پھر اس پر نظر ثانی ہوگی، تبدیلیاں ہوں گی اور اچھا خاصا وقت لگے گا۔

"پھر؟" کمانڈر جاننا چاہتے تھے کہ ہمارے ذہن میں کیا سودا سمایا ہوا ہے۔ ہم نے تجویز دی کہ ہم اکٹھے بیٹھ جائیں اور مل کر ایک ہی بار تقریر لکھ لیں۔ ہم سے مراد جنرل مشرف، جنرل عثمانی اور ہم خود تھے۔ جنرل عثمانی مان گئے۔ انہوں نے جنرل مشرف سے بات کی۔ انہوں نے بھی اس پر صاد کیا۔



راولپنڈی

ادھر جنرل افتخار اپنے دفتر پہنچ چکے تھے۔ ان کے دفتر پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ برآمدے میں آ گئے۔ جوائنٹ سیکرٹری دفاع میجر (ر) شوکت نواز اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ جنرل افتخار بھی وہیں بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے گھر فون کیا اور اپنی اہلیہ کو کہا کہ ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ کچھ پتہ نہیں وہ کب گھر لوٹیں گے۔ فوجی افسروں کی بیویوں کے لئے یہ معمول کی بات ہے۔ وہ چپ ہو رہیں۔ بمشکل انہوں نے ریسیور رکھا ہو گا کہ گھر سے فون آیا۔ انہیں بتایا گیا کہ فوجی دستوں نے رہائش گاہ کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ جنرل افتخار نے ہدایت کی کہ کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے اور وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، انہیں کرنے دیا جائے۔

اتفاق کی بات ہے کہ یہ فوجی ایک ایسی یونٹ سے تعلق رکھتے تھے جو جنرل افتخار کی زیر کمان رہی تھی جب وہ بہاولپور میں کور کمانڈر تھے۔ کور کمانڈر کی حیثیت سے جنرل افتخار بڑے سخت گیر منتظم تھے۔ وہ مردم شناس تھے، کام لینا جانتے تھے اور ہر شخص کو مستعد اور فعال رکھتے تھے۔ ان کے دور میں سرحدوں پر جو دفاعی تعمیرات اور چھاؤنی کے اندر جو ترقیاتی کام ہوئے، ماضی میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی کمان کے اختتام پر رہائشی سہولتیں اتنی زیادہ ہو چکی تھیں کہ نئے آنے والے افسر کو انتظار کئے بغیر گھر مل جاتا تھا۔ پشاور کے بعد یہ دوسری چھاؤنی تھی جہاں یہ سہولت میسر تھی۔ پشاور میں رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کا سہرا جنرل اسلم بیگ کے سر ہے جو وہاں کور کمانڈ

کرتے رہے ہیں۔ جنرل افتخار نظم و ضبط کی سختی سے پابندی کرواتے تھے اور افسروں اور جوانوں کو وردی کے ساتھ غیر ضروری انگوٹھیاں یا چھلے تک پہننے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ وہ جوانوں سے محبت بھی کرتے تھے۔ ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی ہدایت تھی اور اس پر سختی سے عمل ہوتا تھا کہ فوجی مشقوں کے دوران فوجیوں کو گرم کھانا ملے اور مشقوں کے دوران وقفوں میں انہیں آرام کا موقع دیا جائے۔ وہ جب بہاولپور کی کمان چھوڑ کر جا رہے تھے تو عام جوانوں کی آنکھیں پر نم تھیں۔ الوداعی دربار سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے ان کے دل موہ لئے تھے۔ جب یہ کہا کہ انہیں اس بات کا افسوس رہے گا کہ اپنی کمان کے دوران انہیں اس بات کا موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنے جوانوں کے ساتھ مل کر سرحدوں کے دفاع میں اپنے خون کا نذرانہ پیش کریں۔ جوانوں کے ساتھ ان کا تعلق محبت اور شفقت کا تھا اور یہ تعلق آڑے وقت میں اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

تاہم ۱۲ اکتوبر کی رات وقت کا تقاضا کچھ اور تھا۔ فوجیوں کو جو حکم ملا تھا وہ اس کے پابند تھے۔ لیکن انہوں نے احترام ملحوظ رکھا۔ انہوں نے زیادہ پھرتیاں نہیں دکھائیں۔ ایک کیپٹن جنرل صاحب کی رہائش گاہ میں داخل ہوا اور پوچھا کہ جنرل صاحب کے مطالعے کا کمرہ کدھر ہے۔ اسے وہ کمرہ دکھا دیا گیا۔ اس نے میز پر ترتیب سے رکھے ہوئے کاغذات الٹ پلٹ کئے۔ وہ شاید جنرل مشرف کی برطرفی اور جنرل ضیاء الدین کی تقرری سے متعلق نوٹیفیکیشن ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ وہ مزید کوئی کارروائی کئے بغیر باہر اپنے فوجی ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔

وزارت دفاع کے سیکریٹریٹ میں ایڈیشنل سیکرٹری دفاع میجر جنرل (ر) شہزادہ عالم بھی پہنچ چکے تھے۔ جنرل افتخار اپنے دفتر آ گئے تھے۔ ٹیلیویژن آن کر دیا گیا تھا جس پر مستقل ایک سلائیڈ چل رہی تھی کہ جنرل پرویز مشرف جلد قوم سے خطاب کریں گے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھے تھے کہ نو بجے کے قریب جی ایچ کیو سے ایک میجر

صاحب یہ پیغام لائے کہ جنرل افتخار کو چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ عزیز خان بلا رہے ہیں۔ جنرل افتخار ان کے ساتھ جانے کے لئے اٹھے تو ایڈیشنل سیکرٹری میجر جنرل شہزادہ عالم نے بھی ان کے ساتھ جانے کی خواہش کی۔ جنرل افتخار نے انہیں ساتھ لے لیا۔

جی ایچ کیو پہنچنے پر جنرل افتخار اور میجر جنرل شہزادہ عالم کو ملٹری آپریشنز ڈائریکٹوریٹ لے جایا گیا۔ جی ایچ کیو میں سب سے زیادہ حفاظت اسی ڈائریکٹوریٹ کی کی جاتی ہے۔ خود ڈائریکٹوریٹ کے اندر دفتروں، برآمدوں اور آپریشن روم کے ارد گرد سخت پہرہ ہوتا ہے۔ دس بارہ جنرل اور چند بریگیڈیر، آپریشن روم میں جمع تھے اور نقشوں پر فوجی یونٹوں کی نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔ جنرل افتخار کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔

تمام بڑے احترام سے پیش آئے۔ جب سب نے نشستیں سنبھال لیں تو چیف آف جنرل سٹاف، لیفٹیننٹ جنرل عزیز خان جنرل افتخار سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے، ”میں آپ کو دو باتیں بتانا چاہتا ہوں“۔

”جی بتائیے“۔

”پہلی بات یہ کہ فوج کا ایکشن ناگزیر تھا“۔

”دعا کریں کہ یہ ملک کے لئے بہتر ثابت ہو“ جنرل افتخار نے کہا۔

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا“ جنرل عزیز خان نے یقین دہانی کرائی۔

”دوسری بات یہ کہ ہم پورے وثوق سے یہ بات جانتے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کی برطرفی میں آپ ملوث نہیں ہیں“۔

”تو پھر آپ نے ان کی رہائش گاہ پر فوجیوں کا پہرہ کیوں بٹھا دیا ہے“ میجر جنرل شہزادہ عالم سے رہا نہ گیا۔

”میں نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ کس نے جاری کیا ہے یہ حکم؟“ جنرل عزیز

نے اپنے اردگرد بیٹھے افسروں سے پوچھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حکم کس نے جاری کیا ہے یا یہ جاننے کے بعد کہ باس اس پر خوش نہیں ہے، کوئی بھی اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ڈائریکٹر جنرل ملٹری انٹیلی جنس میجر جنرل احسان الحق سے رابطہ کر کے انہیں بتایا گیا کہ جنرل افتخار کی رہائش گاہ سے فوجی ہٹا لئے جائیں۔ انہیں فوری طور پر واپس بلا لیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جنرل افتخار نے جانے کی اجازت چاہی۔

''نہیں۔ آپ نہیں جا سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ آج ہی آپ کی انڈوسکوپی ہوئی ہے۔ آپ نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا، آپ کھانا کھا کر جائیں گے'' جنرل عزیز خان نے کہا۔ سنیکس سے ان کی تواضع کی گئی کہ اس وقت یہی میسر تھے۔ اس کے بعد جنرل افتخار اور میجر جنرل شہزادہ عالم جی ایچ کیو سے واپس آ گئے۔



کراچی

جنرل پرویز مشرف، لیفٹیننٹ جنرل مظفر حسین عثمانی، پنجاب سے آئے ہوئے میجر جنرل اور ہم ایک میز پر بیٹھے تھے اور مسودہ سامنے پڑا تھا۔ ہم نے پہلا پیرا گراف پڑھا۔ اس پر کچھ اعتراضات دائر کئے۔ لکھنے والے صاحب نے ان کا دفاع کرنا چاہا لیکن جنرل مشرف نے اعتراضات کو درست قرار دے دیا۔ پھر ہم نے اس کی جگہ نیا پیرا لکھا اور سنایا۔ منظور ہو گیا۔ دوسرا پیرا پڑھا گیا، اس پر تنقید ہوئی اور مسترد کر دیا گیا۔ ہم نے دوسرا پیرا لکھا۔ تین چار پیرا گراف کے بعد مہمان جنرل صاحب نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ چپکے سے اٹھ جائیں۔ ہم باقی تین نے تقریر مکمل کی۔ جب ایک صفحہ لکھا جاتا تو ہمارے ساتھ کھڑے ایک کیپٹن کے حوالے کیا جاتا جو اسے دوسرے کمرے میں لے جاتا جہاں اسے کمپیوٹر پر کمپوز کیا جا رہا تھا۔ جب تقریر کا مسودہ مکمل ہو گیا تو اسے ایک بار پھر پڑھا گیا۔ اکا دکا تبدیلیاں کی گئیں۔ پھر

جنرل مشرف سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک مرتبہ سکون سے اس مسودے کو پڑھ لیں۔ تمام افسروں سے گزارش کی گئی کہ وہ دوسرے دفتروں میں چلے جائیں اور جنرل مشرف کو تنہا چھوڑ دیں۔ جب انہوں نے مسودہ پڑھ لیا تو ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کور کمانڈر کے دفتر میں آ جائیں جہاں کیمرے اور ریکارڈنگ مشینیں نصب تھیں۔

جنرل مشرف سے کہا گیا کہ وہ کیمرے کے سامنے پہلا پیرا گراف بطور ریہرسل پڑھیں۔ انہوں نے بات مان لی اور پہلا پیرا گراف پڑھا۔ سفر کی ساری تھکن اور واقعات کا اعصابی تناؤ ان کی آواز میں نمایاں تھا۔ ہم نے پانی کا ایک گلاس منگوایا، ان سے پینے کی درخواست کی اور ان سے لہجے میں توانائی پیدا کرنے کو کہا۔ جنرل مشرف نے سوالیہ نظروں سے جنرل عثمانی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے شانے اچکائے اور کیمروں کی طرف دیکھتے ہوئے ابروؤں کے اشاروں سے بتایا کہ وقتی طور پر تو یہی لوگ اتھارٹی ہیں۔

جنرل مشرف مسکرائے اور پہلا پیرا گراف دوبارہ پڑھا۔ اسے درست قرار دیا گیا اور پھر اصل تقریر کی ریکارڈنگ شروع ہوئی۔ آخری پیرا گراف پر ایک دو لفظوں کی ادائیگی میں کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ تقریر مکمل ہونے پر ہم نے اس کا ذکر کیا۔ سوائے اطہر وقار عظیم کے کسی نے اسے محسوس نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ہماری تائید کی۔ آخری پیرا گراف دکھایا گیا، غلطی واضح تھی۔ جنرل مشرف نے پوچھا کہ کیا ساری تقریر دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔ انہیں بتایا گیا کہ نہیں بس آخری پیرا گراف دوبارہ ریکارڈ ہو گا۔ جب ریکارڈنگ مکمل ہوئی تو رات کے ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ ٹی وی کا ایک افسر ہمارے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ تقریر نشر کرتے ہوئے کیا پروٹوکول اختیار کیا جائے۔

''کیسا پروٹوکول؟'' ہم نے پوچھا۔

''کیا قومی ترانہ بجایا جائے گا؟''

کتنی خطرناک تجویز!!! ہم نے انہیں بتایا کہ وہ ابھی تک محض چیف آف آرمی سٹاف تھے اور بہتر ہوگا کہ قومی ترانہ نہ بجایا جائے۔ صرف تقریر نشر کی جائے۔ ہمیں ابھی تک موہوم سی امید تھی کہ شاید صورت حال کوئی مثبت کروٹ لے لے۔ سینٹ کے چیرمین یا قومی اسمبلی کے سپیکر کو بلا لیا جائے اور ملک کو صحیح ڈگر پر ڈال دیا جائے۔ قومی ترانہ ایک علامت بھی ہے اور اس موقع پر اس کا استعمال واقعات کو کوئی اور رنگ دے سکتا تھا۔ اس رات دو بجکر پینتالیس منٹ پر تقریر بغیر کسی پروٹوکول کے نشر ہوئی۔ جنرل مشرف کے لئے "مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" کے الفاظ استعمال نہ کرنے کی ہماری حقیر سی کوشش رائگاں گئی۔ وہ "چیف ایگزیکٹو" بن بیٹھے۔



راولپنڈی

لیفٹیننٹ جنرل (ر) افتخار علی خان نے رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری۔ وہ سوچتے رہے کہ ان کی وفاداریاں نواز شریف کے ساتھ تھیں کہ انہوں نے ہی انہیں سیکرٹری دفاع مقرر کیا تھا۔ اور تمام عمر انہوں نے وردی میں گزاری تھی۔ انہیں یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ وہ چاہیں تو سروس جاری رکھ سکتے ہیں لیکن بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ دو کشتیوں میں سوار نہیں رہ سکتے۔ دوسرے دن وہ دفتر نہیں گئے۔ ۱۴ اکتوبر کو وہ دفتر گئے، اپنا استعفیٰ ٹائپ کروایا اور جنرل مشرف کو بھجوا دیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی پسند کا کوئی آدمی اس عہدے کے لئے منتخب کر لیں۔ اس کا فوری جواب نہیں ملا۔ چند دنوں بعد پریس کو ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ جنرل افتخار کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ اور لیفٹیننٹ جنرل نسیم رانا کو نیا سیکرٹری دفاع مقرر کیا گیا ہے۔ اس میں جنرل افتخار کے استعفے کا کوئی ذکر نہ تھا۔



اختتامیہ

گزشتہ ابواب سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کارگل اپریشن چار جرنیلوں کی ایسی مہم تھی جس کی منصوبہ بندی ناقص اور مقصد اپنی ذات کی قد آوری تھا۔ چونکہ یہ چاروں جنرل فوج میں کلیدی عہدوں پر فائز تھے، ناکامی اور بدنامی پوری فوج سے منسوب ہوئی اور ایک منضبط فوج ہونے کی نیک نامی کا جو تاثر ہمارے فوجیوں نے اقوام متحدہ کے امن قائم کرنے والے دستوں کے ساتھ محنت سے کام کرتے ہوئے اور بے لوث قربانیاں دے کر کمایا تھا، ضائع ہو گیا۔

دوسرے کور کمانڈروں، بحریہ اور فضائیہ کے سربراہوں سے مشورہ کیا گیا نہ انہیں اعتماد میں لیا گیا۔ اور مناسب مشاورت نہ ہونے کی وجہ سے، یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ اس آپریشن سے کوئی نتیجہ حاصل نہ کیا جا سکا اور یہ ایک زبردست تباہی ثابت ہوا۔ دشمن کی قوت کا تخمینہ درست تھا نہ امکانی ردعمل کا جائزہ۔ یہ فرض کر لینا محض اناڑی پن تھا کہ دشمن کو جون تک دراندازی کی خبر ہی نہ ہو پائے گی اور یہ کہ جب تک انہیں خبر ہوگی، وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے اور دراندازی کو قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا۔ ان اندازوں کے برعکس، جب دشمن کو پہلے ہی اس کی خبر ہوئی اور اس نے پوری قوت سے جوابی کارروائی شروع کی تو

اس کے منصوبہ سازوں کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ اب کیا کریں۔ حال یہ تھا کہ دشمن کے ہیلی کاپٹر ہمارے فوجیوں پر گولیاں اور راکٹ برسا رہے تھے اور انہیں کہا جا رہا ہے کہ وہ فائر نہ کھولیں کہ کہیں ان کی موجودگی افشا نہ ہو جائے۔ اس سے مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

انتظام و انصرام بھی جو اس طرح کے آپریشن کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے، ناقص منصوبہ بندی کا شکار رہا۔ ابتدا میں، اگلی چوکیوں پر صرف سات دنوں کا راشن ذخیرہ کیا گیا تھا لیکن بعد میں جب دستوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ظاہر ہے کہ یہ راشن سب کے لئے ناکافی تھا۔ راشن اور اسلحہ مہیا کرنے کا کوئی متبادل انتظام سوچا ہی نہیں گیا تھا۔ نتیجہ؟ فوجی کئی کئی دن تک بھوکے اور پیاسے رہے۔

یونٹوں کو مخصوص اہداف نہیں دیے گئے تھے۔ کمانڈنگ افسروں سمیت یونٹ کے افسروں کو قطعاً خبر نہیں تھی کہ انہوں نے کیا مقاصد حاصل کرنے ہیں۔ بالا ہیڈ کوارٹروں کے افسر بھی آپریشن کے حتمی مقاصد سے لاعلم تھے۔ انہیں جب کچھ یونٹوں نے بتایا کہ وہ کارگل دراس روڈ تک پہنچ گئے ہیں، تو وہ ششدر رہ گئے۔ انہوں نے اس صورت حال سے کوئی استفادہ نہ کیا۔ عقل سلیم کا تقاضہ تھا کہ تھوڑا اور آگے جاتے اور مغرب میں واقع درۂ زوجیلا پر قبضہ کر کے کارگل دراس روڈ کو بلاک کرتے اور دشمن کو مقبوضہ چوکیوں کے علاقے کی طرف نقل و حرکت کی اجازت نہ دیتے۔ درے کو خالی چھوڑنا دشمن کی نقل و حرکت کے لئے مفید ثابت ہوا۔ وہ بآسانی اپنی بہترین توپیں ''بوفور'' درۂ زوجیلا سے گزار کر آگے لائے اور چوکیوں پر قابض فوجیوں پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑے۔

دفاعی ساز و سامان کی سخت قلت تھی۔ اپنے دستوں کو کوئی سائبان میسر نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے توپخانے اور فضائی حملوں سے ہمارا سخت جانی نقصان ہوا۔ پاک فضائیہ کو آخری لمحوں تک اپریشن میں شریک نہیں کیا گیا۔ نتائج واضح تھے۔ دشمن کی فضائیہ کے جہاز کھلے بندوں دندناتے رہے۔ ہمارے انتظامی مستقر تباہ کر دیے

گئے۔ تازہ دستوں یا بار بردار افراد کی اگلی چوکیوں کی طرف نقل و حرکت یا سامان رسد کی فراہمی ناممکن ہو گئی۔ اپنے فوجیوں کو جونیئر افسروں اور جوانوں نے بے مثال شجاعت اور زبردست ایثار کا مظاہرہ کیا۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ ان کی اعلیٰ کمان ایسے افسروں کے ہاتھوں میں تھی جنہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ صورت حال کو کس طرح اپنے حق میں تبدیل کیا جائے۔ چنانچہ وہ ساری قربانیاں رائگاں ہو گئیں۔

یہ آپریشن مجاز سول انتظامیہ کی منظوری حاصل کئے بغیر شروع کیا گیا تھا۔ وزیراعظم کو اس کی خبر اپنے بھارتی ہم منصب سے ملی اور ان کی خاصی سبکی ہوئی۔ سیکرٹری دفاع کو یہ خبر کسی غیر ملکی جریدے سے ملی۔ بریفنگ کا اہتمام ١٧ مئی ١٩٩٩ء کو اس وقت کیا گیا جب سول انتظامیہ نے تفصیلات جاننے پر اصرار کیا۔ پھر بھی اصل حقائق اور زمینی صورت حال چھپاتے ہوئے خوشنما تصویر پیش کی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب بھارت کو دراندازی کی خبر ہو چکی تھی اور اس نے این ایل آئی کی یونٹوں کو بے دخل کرنا شروع کر دیا تھا۔ یونٹوں کا بھاری جانی نقصان ہو چکا تھا اور کئی یونٹوں کو واپسی کے احکامات دیے جا چکے تھے لیکن وزیراعظم کو یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ دشمن مجاہدین اور این ایل آئی کے دستوں کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ بعد ازاں ٢ جولائی کو کابینہ کی دفاعی کمیٹی کو بریفنگ دی گئی تو یہ نہیں بتایا گیا کہ تزویراتی اہمیت کی حامل چوکیاں دشمن نے خالی کروالی ہیں۔ (مثلاً تولولنگ کی پہاڑیوں پر دشمن ١٢ جون کو قابض ہو چکا تھا) اس کے بعد لائن آف کنٹرول کے پار اپنے دستوں کو تعینات رکھنا ناممکن ہو چکا تھا اور تقریباً تمام یونٹوں کو واپسی کے احکامات دیے جا چکے تھے۔ اس وقت بھی کابینہ کی دفاعی کمیٹی کو یہ یقین دہانی کرائی جا رہی تھی کہ بھارت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف زمین پر، سمندر میں یا فضاؤں میں کسی جارحیت کا ارتکاب کر سکے اور یہ کہ بھارتی فوجیں اپنی زبردست قوت کے باوجود حریت پسندوں اور این ایل آئی کے یونٹوں کو ان چوکیوں سے بے دخل نہیں کر سکتا جن پر وہ قابض ہیں۔

(ان دی لائن آف فائر۔ صفحہ 97)

چونکہ کارگل آپریشن سیاسی قیادت کو اعتماد میں لئے بغیر شروع کیا گیا تھا اس لئے سفارتی محاذ پر دوسرے ممالک کو اعتماد میں لینے کے لئے بھی کوئی کوشش نہیں ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان اقوام عالم میں تنہا رہ گیا۔ ہم یہ کہتے رہے کہ ہمارے فوجی دستوں نے لائن آف کنٹرول عبور نہیں کی لیکن کسی نے ہمارا اعتبار نہ کیا۔ جی۔ ایٹ کے ممالک نے ایک قرارداد منظور کی جس میں پاکستان سے غیر مشروط واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امریکی کانگریس کی امور خارجہ کی کمیٹی نے اپنی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ، عالمی بنک اور ایشائی بنک سے پاکستان کے لئے منظور ہونے والے قرضے منسوخ کرانے کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے۔ وہ آئی ایم ایف سے پاکستان کو ملنے والا ایک ارب ڈالر کا قرضہ رکوا چکے تھے۔ یورپی یونین نے بھی سخت الفاظ میں ایک قرارداد منظور کی جس میں کارگل کی قابض چوکیوں سے فوجی دستے واپس بلانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جب کہیں سے بھی اخلاقی مدد نہ ملی تو مایوس ہو کر وزیراعظم نے ۲۸ جون کو چین کا رخ کیا۔ چین نے آزمائش کی ہر گھڑی میں ہمارا ساتھ دیا ہے لیکن کارگل کے معاملے پر وہ بھی ہمارے موقف اور منطق کو نہ سمجھ سکے اور نرمی سے فوجوں کی واپسی کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد وزیراعظم کے پاس اس کے سوا کیا چارہ کار باقی رہ گیا تھا کہ وہ فوجوں کی واپسی کے لئے کوئی باعزت راستہ اختیار کریں۔ انہوں نے واشنگٹن میں جو کچھ بھی کیا وہ وقت اور نازک حالات کا تقاضا تھا۔

مجاہدین ایک زبردست قوت اور قیمتی سرمایہ تھے۔ یہ وہ بے لوث لوگ تھے جو اپنی جانوں پر کھیل کر معجزے انجام دے سکتے تھے لیکن انہیں مناسب انداز میں آپریشن میں شریک نہیں کیا گیا۔ ملک کا سب سے بڑا نقصان چیف آف آرمی سٹاف کی ''بے وقار برطرفی'' کا بہانہ بنا کر جمہوری طور پر منتخب حکومت کا تختہ الٹنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر چیف آف آرمی سٹاف کی تبدیلی عمل میں آجاتی تو ان تمام افراد کو جو کارگل آپریشن شروع کرنے کے ذمہ دار تھے، کوٹ مارشل کا سامنا کرنا پڑتا۔

